اسلام کے نامور فرزند

نظر زیدی

احسن برادرز، چوک انار کلی، لاہور

بار اوّل ۱۹۶۴ء
تعداد دو ہزار
قیمت تین روپے

شیخ محمد ریاض ہمایوں نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر احسن برادرز
انارکلی لاہور سے شائع کی

فہرست مضامین

دیباچہ

اس کتاب میں اسلام کے ان نامور فرزندوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کے اچھے اصولوں کو پھیلانے اور اپنی قوم کی عزت بڑھانے کے سلسلے میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ہماری قوم میں ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے صرف چند ایک کے حالات لکھے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے ہی آپ کو یہ بات معلوم ہو جائے گی

کہ ہمارے بزرگوں نے انسانی تہذیب کو نکھارنے سنوارنے میں نہایت شاندار کارنامے انجام دئیے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ عزت والے بزرگ سچائی کی حفاظت نہ کرتے تو ہماری دنیا درندوں سے بھرے ہوئے جنگل کی طرح خوفناک بن جاتی۔ اور اب تک تہذیب اور شائستگی کی ساری علامتیں مٹ چکی ہوتیں۔

ہم یہ بات مانتے ہیں کہ دوسری قوموں کے لوگوں نے بھی بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ اور آج بھی عظیم کارنامے انجام دے رہے ہیں خاص طور سے سائنسدانوں اور موجدوں کی اہمیت سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن ان کی یہ ساری کوششیں مادی علوم و فنون کو ترقی دینے تک محدود ہیں۔

یہ علوم و فنون بھی اپنی جگہ یقیناً مفید ہیں۔ لیکن روحانی اور اخلاقی تعلیم کے بغیر ان کے سارے فائدے ختم ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی کسی بھی ایجاد کو لے لیجئے وہ اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک یہ احتیاط برتی جاتی ہے۔ کہ کہاں اسے استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اور کہاں نامناسب۔ مثال کے طور پر ریڈیو جیسی بے ضرر چیز کو پوری رفتار سے کھول دیجئے۔ پاس پڑوس کے لوگوں کا سکون غارت ہو جائیگا۔ اس کی آواز اس وقت تک کانوں کو بھلی لگتی ہے جب تک اسے

ایک خاص حد کے اندر رکھا جاتا ہے اور اسے ایک خاص حد کے اندر رکھنے کا احساس اخلاق اور شرافت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ہمارے مقدس مذہب نے اسی اخلاق اور شرافت کی تعلیم دی ہے اور ان بزرگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دے کر اور تکلیفیں اٹھا کر اس تعلیم کو دنیا میں پھیلایا ہے۔ اور اس خوبی کی وجہ سے ان کا رتبہ موجدوں اور سائنسدانوں سے بہت بڑھ جاتا ہے۔

نئے زمانے کی ضرورتوں کا خیال کر کے ہمارے ملک پاکستان میں بھی سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ اس علم میں ترقی کر کے ہی ہم اپنے پیارے وطن کو خوبصورت اور طاقتور بنا سکتے ہیں اور اس کی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ جب تک ہم پوری طرح اپنے مذہب کی اچھی باتوں پر عمل نہیں کریں گے اور صحیح معنوں میں شریف، بہادر اور دانشمند نہیں بنیں گے دنیا میں کوئی اونچا مقام حاصل نہ کر سکیں گے۔

مجھے یقین ہے ان عزت والے بزرگوں کی شاندار زندگیوں کے حالات پڑھ کر آپ کے دلوں میں اخلاق اور شرافت کی اعلیٰ خوبیاں پیدا کرنے کی امنگ پیدا ہو گی اور اسی امنگ کے سہارے ایک شاندار زندگی حاصل کریں گے انشاءاللہ!

نظر زیدی

نولکھا پارک لاہور
۵ جنوری ۱۹۶۴ء

امام غزالیؒ

مسلمانوں کو شروع زمانے سے علم سے لگاؤ رہا ہے اسلامی علوم کو ترقی دینے کے علاوہ عباسی خاندان کی حکومت کے زمانے میں مسلمان عالموں نے یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ یہ ایک خاص علمی خدمت تھی لیکن چونکہ یہ فلسفہ اسلام کے اصولوں سے مختلف تھا اس لئے ایک بڑی خرابی یہ ظاہر ہوئی کہ بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں نے اسلام کی سادہ اور سچی باتوں کو چھوڑ کر اس فلسفے کو اپنا لیا اور بغداد کے علمی حلقوں میں نہایت فضول قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ مثلاً خدا کیا ہے، روح کیا ہے، ہم دنیا میں اپنی مرضی اور پسند سے کام کرتے ہیں یا خدا کے احکام کے تابع ہیں۔ وغیرہ ۔ یہ ایک ایسی برائی

تھی۔ کہ اگر اسے دور نہ کیا جاتا تو مسلمان قوم کے سوچنے کا انداز بدل جاتا اور ایسا ہونے سے یہ قوم ان برکتوں سے محروم ہو جاتی جو اسلام کی وجہ سے اسے حاصل ہوئی تھیں۔

حضرت امام غزالیؒ نے یہ اہم خدمت انجام دی۔ آپ نے اسلام کے اصولوں کو ایسی قابلیت سے پیش کیا۔ کہ یونانی فلسفے کا بڑھتا ہوا اثر رک گیا اور یہ قوم پھر اپنی اصل منزل کی طرف لوٹ آئی۔ اس خدمت کی وجہ سے امام صاحب کو بہت بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ آپ کی لکھی ہوئی کتابیں آج بھی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

خاندانی حالات:

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کا اصل نام محمد تھا۔ چار پشتوں تک شجرہ نسب یہ ہے۔ محمد بن محمد بن محمد بن احمد۔ آپ ایران کی ایک بستی طوس میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش ۴۵۰ھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم طوس ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے عراق آ گئے۔ اس زمانے میں عراق اور شام پر خاندان سلجوقی کا مشہور بادشاہ الپ ارسلان حکمران تھا۔ اس بادشاہ کا وزیر نظام الملک طوسی بے حد علم دوست تھا۔ اس نے مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی قائم

کی تھی جس میں بہت سے طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان طالبعلموں کے کھانے رہائش اور کتابوں وغیرہ کا سارا خرچ حکومت ادا کرتی تھی۔ امام صاحب نے اسی یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

ایک خاص واقعہ:

جس وقت امام صاحب عراق کی طرف آرہے تھے۔ سفر کے دوران ایک خاص واقعہ پیش آیا۔ انکا قافلہ ایک ویرانے میں پہنچا تو اچانک ڈاکوؤں کے ایک بہت بڑے گروہ نے حملہ کر دیا اور قافلے والوں کا سارا سامان لوٹ کر لے گئے۔

امام صاحب کے پاس مال و دولت تو کچھ نہ تھا لیکن ایک ایسی چیز ضرور تھی جسے وہ بہت زیادہ قیمتی خیال کرتے تھے۔ یہ ایک قلمی کتاب تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے ایک قابل استاد کی تقریریں اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ ڈاکو یہ کتاب بھی چھین کر لے گئے۔ امام صاحب اس قلمی کتاب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کے چھن جانے سے آپ کو بہت رنج ہوا اور اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے کتاب واپس کرنے کے لئے کہا۔ یہ شخص تھا تو ڈاکوؤں کا سردار لیکن بہت سمجھدار تھا۔ امام صاحب

کی بات سن کر بولا "بھلا یہ بھی کوئی علم ہے کہ اگر کاغذ کے چند پرزے چھین لیے جائیں تو تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے!"

امام صاحب کو ڈاکو سردار کی یہ بات بہت معقول معلوم ہوئی، آپ نے اسی دن سے اس کتاب کو زبانی یاد کرنا شروع کر دیا اور معمولی سے عرصے میں پوری کتاب حفظ کر لی۔

اس چھوٹے سے واقعے سے امام صاحب کے علمی شوق اور حافظے کی قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اپنی ان اچھائیوں کی مدد سے آپ نے بہت جلد کمال حاصل کر لیا اور چھوٹی عمر ہی میں اس وقت کے بڑے عالموں میں گنے جانے لگے۔

وزارت

شاہ الپ ارسلاں نے آپ کی قابلیت کا شہرہ سنا تو اپنا وزیر مقرر کر لیا اور خوب عزت کی۔ یہ عہدہ معمولی نہ تھا، کوئی اور ہوتا تو اسی پر قناعت کر لیتا اور خوب عیش و آرام سے زندگی بسر کرتا۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ پاک عقل کا نور دیتا ہے اور جو صحیح معنوں میں بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ دنیاوی عزت اور عیش و آرام کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے بلکہ ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو انہیں سب سے اچھے

معلوم ہوتے ہیں۔ امام صاحب کو علم سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے آپ نے اس کی طرف توجہ دی، کچھ عرصہ وزارت کے منصب پر کام کرنے کے بعد مدرسہ نظامیہ میں استاد مقرر ہو گئے اور اپنی ساری توجہ علم پھیلانے کے مبارک کام میں لگا دی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف ۳۴ سال تھی۔

عظیم مسلمان فلسفی:

درس تدریس کے ساتھ امام صاحب نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ نے یہ کام صرف شوق پورا کرنے اور اپنا نام چمکانے کے لئے نہیں کیا۔ بلکہ اسلام کی ترقی اور دنیا میں بھلائی پھیلانے کا اونچا مقصد سامنے رکھا۔

اس زمانے میں اسلامی ملکوں میں وہ بہت بڑا فتنہ پھیل رہا تھا۔ جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے۔ یہ فتنہ اسلام کے نام پر غیر اسلامی باتوں کو پھیلانا اور ان پر لمبی لمبی بحثیں کرنا تھا۔ یہ خرابی خاص طور سے یونانی فلسفے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ فلسفہ اس علم کو کہتے ہیں جس کی مدد سے چیزوں کی اصلیت اور فائدہ نقصان معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ علم بے حد مفید ہے۔ ایک زمانے میں یونانیوں نے اس علم

کو بہت ترقی دی تھی۔ بقراط، سقراط، جالینوس، فیثا غورث اور ارسطو وغیرہ اونچے درجے کے یونانی حکیموں نے اس علم کی اچھی اچھی کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سقراط اور کئی دوسرے عالم ایسے بھی تھے جو خدا کو ماننے والے تھے۔ لیکن زیادہ تعداد ایسے عالموں کی تھی جو خدا کے وجود کے قائل نہ تھے۔ یہ عالم عقل کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت خیال کرتے تھے اور ہر بات کو عقل کی مدد سے سمجھنا چاہتے تھے۔

اس کے مقابلے میں اسلام نے یہ تعلیم دی ہے۔ کہ اصل اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور دنیا کا سارا انتظام اُسی کی منشا کے مطابق چل رہا ہے۔ ہمیں چاہیئے صرف ان باتوں میں عقل پر بھروسہ کریں جن کا اللہ پاک نے حکم دیا ہے۔

▪ مسلمان عالموں نے یونانی فلسفے کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کئے اور یہ فلسفہ عام لوگوں تک پہنچا تو انہوں نے اسلام کی سچی اور آسان باتوں کی جگہ ایسے مسئلوں پر بحثیں کرنی شروع کر دیں جن کا نتیجہ برائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہماری مذہبی زبان میں اس گروہ کو متکلمین کی جماعت کہتے ہیں۔

حضرت امام غزالی ؒ نے اس برائی کو محسوس کیا تو علمی انداز میں متکلمین کی پھیلائی ہوئی باتوں کا جواب لکھا اور اللہ پاک نے آپ کی زبان اور

قلم میں ایسا اثر دیا۔ کہ یونانی فلسفے کا طلسم ٹوٹ گیا اور لوگ پھر اپنے سچّے مذہب اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ اس سلسلے میں آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں احیاء العلوم کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ کتاب آج بھی اسی طرح عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اور اونچے درجے کے اسلامی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

عمل اور قول میں مطابقت:

عام انسانی سیرت کا ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے۔ صحیح معنوں میں کامیابی اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جس کے قول اور عمل میں مطابقت ہو یعنی جو ان باتوں پر خود بھی عمل کرتا ہو جنہیں دوسروں کے سامنے پیش کرے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے حالات پر غور کریں تو ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے۔ کہ آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت تھی۔ اور باتوں کے علاوہ اس کا ایک بڑا ثبوت آپ کی زندگی کے ایک خاص واقعے سے ملتا ہے

جس زمانے میں آپ مدرسہ نظامیہ میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہے تھے اور شاہی دربار میں بھی آپ کو ہر طرح کی عزت حاصل تھی۔ آپ کے

ذہن پر اس خیال نے غلبہ پا لیا۔ کہ دنیاوی عیش و عشرت میں گھر جانے والا انسان نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص خدا کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے سارے کام چھوڑ کر صرف اللہ پاک کی عبادت کریں۔
یہ بات اس حد تک تو بالکل ٹھیک ہے۔ کہ جو لوگ عیش و عشرت میں ڈوب جاتے ہیں اور حق و ناحق کے فرق کو نظر میں نہیں رکھتے وہ اللہ پاک کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس برائی سے بچنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں، کہ دنیاداری کے سارے کام چھوڑ ہی دیئے جائیں۔ ہمارے مقدس مذہب اسلام نے اس برائی سے بچنے کا یہ طریقہ بتایا ہے۔ کہ ہم جب بھی کوئی کام کرنے لگیں یہ سوچ لیں کہ ایسا کرنے سے ہمارا خدا خوش ہوگا یا ناراض! جو باتیں بری معلوم ہوں اُن سے ہاتھ روک لیں اور جو کام اچھے نظر آئیں انہیں تکلیف اٹھا کر بھی کریں۔ گویا دنیا کے کاموں کو چھوڑ نہ دیں بلکہ ان میں پاکیزگی اور اچھائی پیدا کریں۔
لیکن وقتی طور پر امام صاحب نے پہلی بات کو ٹھیک جان لیا اور چونکہ آپ کے خیال اور عمل میں پوری پوری مطابقت تھی اس لئے آرام و اطمینان کے سارے سامان چھوڑ کر اور ایسے اونچے عہدے سے استعفےٰ دے کر دمشق چلے گئے۔ آپ کے عقیدت مندوں اور دوستوں نے بہت منع کیا لیکن آپ نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا۔

دمشق جاکر آپ اِس شہر کی مشہور مسجد جامع اموی کے ایک مینار میں بیٹھ گئے اور تقریباً دو سال دنیا سے الگ تھلگ رہ کر اللہ پاک کی عبادت کرتے رہے۔

اللہ پاک نے سیدھا راستہ دکھایا:

جو لوگ کسی کام کو پوری پوری نیک نیتی کے ساتھ کرتے ہیں، اللہ پاک ان کی غلطیاں معاف فرما دیتا ہے اور ان کی لغزشوں کے بدلے بھی ثواب ملتا ہے۔ امام صاحب نے اگر دنیا کو ترک کیا تھا تو اس میں خدانخواستہ آپ کی ضد یا بدنیتی نہ تھی۔ بلکہ یہ سمجھ کر دنیا سے کنارہ کش ہوئے تھے کہ اِس انداز سے زندگی گذاروں گا تو میرا خدا مجھ سے خوش ہوگا۔ چنانچہ اِس نیک نیتی کا یہ انعام ملا کہ رفتہ رفتہ ایسے خیالات آپ کے ذہن سے مٹ گئے اور پہلے سے بھی زیادہ سچے اور پُرجوش مسلمان بن کر لوٹے۔

دنیا ترک کر دینے اور کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کو مذہبی زبان میں رہبانیت کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی صورت سے تعلق رکھتا ہے، جب اس مذہب کے ماننے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کو بھول گئے تو ان کے

اندر ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا جو دنیا سے الگ ہو کر عبادت کرتے رہنے کو نجات کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کو راہب کہا جاتا ہے۔
عیسائی راہبوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی ایک ایسا ہی فرقہ پیدا ہو گیا تھا، یہ لوگ صوفی کہلاتے تھے اور ان کے مسلک یا عقیدوں کو تصوّف کہا جاتا تھا۔ حضرت امام صاحب کے ذہن پر در اصل اسی فرقے کے خیالات کا اثر ہوا تھا۔ اور اس بارے میں ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ تبدیلی بھی اللہ پاک کی مصلحت کے مطابق ہی ہوئی تھی۔ ایسا ہونے کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا۔ کہ آپ اس عقیدے کی ساری خامیوں سے واقف ہو گئے اور یونانی فلسفے کی برائیاں ظاہر کرنے کے علاوہ آپ نے اس غلط قسم کے تصوّف کی برائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا اور آپ کی ان عمدہ تحریروں سے بہت سے مسلمانوں کے عقیدے درست ہو گئے ؛

حج اور دینی خدمات :

جامع اموی کے مینار سے اُٹھنے کے بعد آپ نے ۴۹۹ھ میں حج کا فرض ادا کیا اور اس مبارک سفر سے آ کر پھر مدرسہ نظامیہ میں درس تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ زندگی

کے اس دور میں آپ کی ذات سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اب آپ کی حیثیت اس کھرے سونے کی ہو گئی تھی جو مختلف بھٹیوں میں تپ کر ہر قسم کے میل کچیل سے پاک ہو چکا ہو۔

ایک روایت کے مطابق آپ کے درس میں تین سو مدرس اور[15] ایک سو کے قریب اونچے درجے کے امیر حاضر ہوتے تھے تقریباً ایک ہزار شاگردوں نے دین اور فلسفے کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تصنیف و تالیف کی مشغولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ کہ اگر آپ کی کتابوں اور پوری عمر کا حساب کیا جائے تو ۱۶ صفحے روزانہ کی اوسط بیٹھتی ہے۔

وفات :

یہ مفید، بلکہ مفید تر خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ سن ولادت اور تاریخ وفات کا حساب جوڑیں تو آپ کی عمر صرف ۵۵ سال بنتی ہے۔ زندگی کی یہ صدت بہت کم ہے لیکن اس کم مدت ہی میں آپ ایسے مفید کام کر گئے کہ رہتی دنیا تک آپ کا نام روشن رہے گا۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی حالت کا خیال کرتے ہوئے

ہمارے قومی شاعر علامہ اقبالؒ مرحوم نے اپنی مشہور نظم جواب شکوہ میں لکھا ہے ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

اس شعر کے دوسرے مصرع سے حضرت امامؒ صاحب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمیں چاہیے اس عزت والے بزرگ کی زندگی سے یہ سبق سیکھیں کہ جب تک پورے شوق سے علم حاصل نہ کریں کسی قسم کا کمال حاصل نہیں کر سکتے اور کمال حاصل کرنے کے بعد جب تک پورے پورے دیانتدار، ایماندار اور لوگوں کا بھلا چاہنے والے نہ بن جائیں اس کمال سے فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اے خدا تو ہم سب کو زیادہ سے زیادہ اچھا بننے کی توفیق دے۔ ہماری ذات سے دنیا میں بھلائی پھیلے اور تیرا سچا دین سب پر غالب آجائے !!

سعدی شیرازیؒ

اللہ پاک نے قرآن شریف کی سورہ العلق میں فرمایا ہے:

"پڑھ اور تیرا رب کریم ہے جس نے علم
سکھایا قلم سے سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔"

اس آیت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے جو علم ہر قسم کی ترقی کا سبب ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو دیگر مخلوق پر فضیلت دی گئی۔ اس کی اصل قلم ہے۔ قلم اگرچہ دیکھنے میں ایک چھوٹا سا آلہ ہے لیکن اثر اور طاقت میں اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ اس نے نئی سلطنتیں بنائی ہیں۔ پرانی سلطنتوں میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں اور بھلائی پھیلانے کے لئے پاکیزہ خیالات

حضرت مصلح الدین سے تعلیم حاصل کی اور صرف گیارہ سال کی عمر میں قرآن شریف کے حافظ ہو گئے۔

سعدی بہت ذہین اور اچھی عادتوں کے مالک تھے، یہ دولت انہیں اس وجہ سے ملی تھی، کہ وہ اپنے والد صاحب کا پورا پورا احترام کرتے تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔ ذہانت کے بارے میں یہ بات خاص طور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ کہ اللہ پاک یہ خوبی ہر بچے کو دیتا ہے، بہت ہوا انیس بیس کا فرق ہو گیا۔ اگر فرق پڑتا ہے تو بچوں کی عادتوں کی وجہ سے اس کی ایک اچھی مثال آئینے کی ہے۔ اگر کوئی شخص صاف شفاف آئینے کی حفاظت نہ کرے تو وہ بہت جلد گرد وغبار اور داغوں سے بھر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں چہرہ نظر نہیں آتا لیکن اگر کوئی دھندلا آئینہ لے کر اسے صاف کرے، دھوئے اور پھر پوری طرح احتیاط کرتا ہے تو نئے اور چمکدار آئینے کی طرح کام دینے لگتا ہے، بالکل اسی طرح جو بچے کھلنڈرے، پیٹو اور نافرمان یعنی بڑوں کا حکم نہ ماننے والے بن جاتے ہیں اور پڑھنے لکھنے کو ایک قسم کی سزا خیال کرتے ہیں۔ ان کے ذہن کا آئینہ دھندلا ہو جاتا ہے، بہر حال یہ تو ایک فالتو بات تھی، ہم بتا یہ رہے تھے کہ سعدی بے حد ذہین اور محنتی طالب علم

تھے۔ اس سلسلے میں ایک شاندار واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔
جس زمانے میں سعدی پیدا ہوئے اس علاقے کا حاکم ابوبکر
سعد بن زنگی تھا۔ سعدی کے ماموں اس کے دربار میں جایا کرتے تھے
ایک دن وہ سعدی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت ان کی
عمر صرف بارہ سال تھی۔ ابوبکر نے اچھی عادتوں والے اس بچے کو
دیکھا تو محبت سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا برخوردار! تمہاری عمر کیا ہے؟
کوئی اور بچہ ہوتا تو شاید گھبرا جاتا۔ کہنا کچھ چاہتا زبان سے کچھ
نکلتا۔ یا ٹھیک جواب بھی دیتا تو سادہ طریقے سے بتا دیتا میری عمر
اتنے سال ہے۔ لیکن سعدی نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا۔ اس نے نہایت
میٹھی زبان میں جواب دیا۔ حضور کی سلطنت سے بارہ سال چھوٹا ہوں۔
حساب کے مطابق یہی سعدی کی ٹھیک عمر تھی۔ جواب دینے کے اس
انداز سے ابوبکر بہت خوش ہوا اور ان کے حال پر خاص شفقت کرنے
لگا۔ کہتے ہیں سعدی نے اسی کے نام کی مناسبت سے اپنا تخلص سعدی
رکھا۔

بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں:

علامہ مصلح الدین کے علاوہ سعدی نے شیراز میں چند اور عالموں

سے بھی تعلیم حاصل کی، اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک ان کی والدہ صاحبہ زندہ رہیں۔ قضائے الٰہی سے ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے بغداد جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس زمانے میں مدرسۂ نظامیہ کے نام سے بغداد میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم تھی۔ جو طلباء یہاں تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی کتابوں، خوراک اور لباس وغیرہ کا سارا خرچ حکومت اٹھاتی تھی۔

یہ یونیورسٹی ایک نیک دل وزیر نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ میں قائم کی تھی اور انہی کے نام پر اس کا نام رکھا گیا تھا۔

سعدی ۱۱۹۶ء میں مدرسۂ نظامیہ میں داخل ہوئے اور تقریباً بائیس تیئیس سال نہایت محنت سے تعلیم حاصل کرتے رہے، پرانے زمانے کی باتیں لکھتے وقت معمولی غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، ممکن ہے وہ اتنا لمبا عرصہ اس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم نہ رہے ہوں، بہر حال یہ بات بالکل درست ہے کہ انہوں نے نہایت امتیاز کے ساتھ فضیلت کی سند لی۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں مدرسۂ نظامیہ کے استادوں میں بڑے بڑے فاضل اور نامی گرامی علمائے دین شامل تھے، ان میں علامہ ابن جوزیؒ کا نام خاص ہے، علامہ موصوف اپنے زمانے کے اتنے بڑے عالم تھے کہ ان کی ذات پر اب تک فخر کیا جاتا ہے۔

علامہ جوزیؒ کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ درس تدریس کے بعد جو وقت بچتا تھا۔ اس میں وہ تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کتابت کرنا اُن کا خاص مشغلہ تھا۔ انہوں نے اس مبارک کام پر اپنا کتنا وقت صرف کیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ جب اُن کا انتقال ہوا تو انہیں غسل دینے کے لئے قلم کے تراشے سے پانی گرم کیا گیا۔ کہتے ہیں وہ احادیث لکھنے کے لئے قلم بناتے تھے تو تراشہ ایک کوٹھڑی میں جمع کرتے جاتے تھے اور مرنے سے پہلے وصیت کی تھی۔ کہ میری میت کے غسل کے لیے اسی تراشے سے پانی گرم کیا جائے۔ تراشہ اتنا زیادہ تھا۔ کہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی کافی بچ رہا۔

سیاحت :

ایسے عالم فاضل اور پاک دل عالموں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سعدیؒ کی قابلیت کتنی بڑھ گئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، اگر وہ عیش آرام سے زندگی گذارنے کا ارادہ کرتے تو یہ بات کچھ مشکل نہ تھی۔ کسی بادشاہ کے دربار میں انہیں آسانی سے کوئی منصب مل سکتا

تھا لیکن علم نے انہیں انسان کی زندگی کے اصلی مقصد کی طرف راغب کر دیا تھا۔ یہ مقصد ہے اللہ پاک کے احکام کے مطابق دنیا سے برائی کو مٹانا اور بھلائی کو پھیلانا۔ شیخ سعدی نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بڑے بڑے ملکوں کے سفر کیے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں جاتے تھے اور نہایت قابلیت سے انہیں یہ بات سمجھاتے تھے۔ کہ عیش عشرت میں پھنسے رہنا اور لوگوں پر ظلم کرنا بہت بری بات ہے۔ اگر خدا نے تمہیں بڑا بنایا ہے تو لوگوں کے ساتھ انصاف کرو اور خلقِ خدا کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہو۔ پھر ان کی یہ تبلیغ بادشاہوں اور امیروں تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ جہاں بھی موقع ملتا تھا وہ یہ اچھی باتیں لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ اور انہیں سچائی کے راستے کی طرف لانے کی کوشش کرتے تھے اور چونکہ یہ باتیں ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں اس لئے لوگوں پہ ان کا اثر ہوتا تھا۔

بعض روایتوں کے مطابق سعدی نے پا پیادہ چودہ حج کیے۔ اس کے علاوہ وہ براعظم ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں گھومے بلکہ یورپ بھی گئے۔ ہمارے زمانے میں یہ بات کچھ مشکل نہیں ہر جگہ ہوائی جہازوں، ریلوں اور موٹروں کا انتظام ہے، ایک بچہ بھی دور

دراز کا سفر کر سکتا ہے لیکن اُس زمانے میں ایسی آسانیاں نہ تھیں نہ صاف ستھری سیدھی سڑکیں تھیں نہ ایسی اچھی سواریوں کا انتظام تھا۔ لوگ عموماً گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں پر سفر کرتے تھے، جن کے پاس یہ سواری بھی نہ ہوتی تھی وہ پیدل چلتے تھے اور خطرناک جنگلوں اور ریگ زاروں سے گذر کر اپنی منزل پر پہنچتے تھے، ان دشواریوں کے علاوہ چوروں، ڈاکوؤں اور درندوں کا خطرہ الگ رہتا تھا سفر کرنے والوں میں بہت ہی خوش نصیب لوگ بغیر کسی پریشانی اور نقصان کے منزل پر پہنچتے تھے۔

ان سب باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے سعدی کی اس سیر سیاحت کے بارے میں سوچیں تو ان کی بہادری، ہمت اور عزم بلند کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

وطن کو واپسی:

کافی لمبا عرصہ سیر و سیاحت میں گذارنے کے بعد سعدی کو وطن یاد آیا۔ یہ ۶۵۵ھ کی بات ہے۔ ابوبکر سعد بن زنگی کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کے وطن میں بڑی بڑی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ یہاں آکر اس بات کی بہت گنجائش تھی۔ کہ وہ دربار میں کوئی اونچا منصب حاصل کر

لیتے۔ کیونکہ اب وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کا کلام تقریباً
ساری دنیا میں مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا اور جس کا نام شہرت
کے آسمان پر سورج کی طرح روشن تھا۔ لیکن انہوں نے گوشہ نشینی کی
زندگی اختیار کی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی۔ کہ وہ کافی بوڑھے ہو
چکے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ اطمینان بھی حاصل ہو چکا ہو گا۔ کہ
انہوں نے اپنا فرض بڑے اچھے طریقے سے ادا کیا ہے۔

اگرچہ اب سعدی کسی سے میل جول نہ بڑھاتے تھے لیکن ان کی
مقبولیت میں فرق نہ آیا۔ علم و ادب کے قدردان اور نیکی سے محبت
کرنے والے لوگ سچے دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۵۵ء سے
لے کر سنہ ۱۲۹۲ء تک وہ اپنے وطن ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ قدرت
کے قانون کے مطابق موت کا پیغام آگیا۔

شیراز کے ایک امیر خواجہ علاء الدین نے سعدی کی زندگی ہی میں
انکے مقبرے کی تعمیر کے لئے انہیں پچاس ہزار دینار دے دئے تھے۔
اور اس رقم سے انہوں نے مقبرہ بنوا لیا تھا۔ انہیں اسی مقبرے میں
دفن کیا گیا۔ یہ مقبرہ شیراز میں اب بھی موجود ہے، جو لوگ ایران کی سیر
کے لئے جاتے ہیں وہ سعدی کے مقبرے کی زیارت ضرور کرتے
ہیں۔

سعدی کا کردار:

سعدیؒ علم اور عمل دونوں لحاظ سے کامل انسان تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی خلقِ خدا کی بھلائی کے کاموں میں گذاری۔ اگر وہ چاہتے تو ڈھیروں مال و دولت اکٹھا کر کے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے لیکن انہوں نے ایثار اور قربانی کا راستہ اختیار کیا۔ اس حکیم کی طرح نگر نگر گھومتے پھرے جو دنیا سے بیماریوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ہر مریض کی امداد کے لئے اس گھر پہنچ جاتا ہے۔

بعض آدمی صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں یعنی وہ باتیں تو بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں اور دوسروں کو ان باتوں پر عمل کرنے کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں لیکن خود عمل نہیں کرتے۔ لیکن سعدی گفتار کے غازی ہونے کے ساتھ کردار کے غازی بھی تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات سب نے مانی ہے۔ کہ وہ بڑے بڑے سخت مزاج بادشاہوں کے درباروں میں بھی حق بات کہنے سے نہ ہچکچاتے تھے۔ ہاں ان کے ٹوکنے اور نصیحت کرنے کا انداز کسی قدر مختلف تھا۔ وہ ایسی میٹھی زبان اور خوبصورت پیرائے میں نصیحت کرتے تھے۔ کہ ان کا مخاطب انہیں اپنا دوست خیال کر کے ان کی بات پوری توجہ سے سنتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ ان کی

شیرینیٔ گفتار کے بارے میں لوگوں کی یہ رائے تھی کہ یہ شخص الفاظ کے ذریعے دوسروں پر جادو کر دیتا ہے۔ یہ در اصل جادو وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سعدی وہی الفاظ استعمال کرتے تھے جو عام لوگوں کی زبانوں سے ادا ہوتے تھے، اگر ان کی بات میں اثر تھا تو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتے تھے اور وہ بنی نوع انسان کے سچے خیر خواہ تھے۔

بے نفسی اور صبر و توکل :

شان و شوکت کی خواہش اور عیش و عشرت کی تمنا، یہ دو باتیں ایسی ہیں جنہیں ہر قسم کی برائی کی جڑ خیال کرنا چاہیئے۔ اگر تحقیق کریں تو پتہ چلے گا ہر بے اصول اور برا آدمی انہی خواہشوں کی وجہ سے گناہ کی دلدل میں پھنسا ہو گا۔ اللہ پاک جن لوگوں پر خاص مہربانی فرماتا ہے وہ یہ بات سمجھ لیتے ہیں کہ سچی عزت شان و شوکت دکھانے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بھلائی کے کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے حقیقی اطمینان اور آرام انہیں ملتا ہے جو صبر و توکل کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

سعدی انہی خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو اچھائی اور برائی

کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں اور پاکیزہ اصولوں کے مطابق زندگی گذارتے ہیں۔ ان کی زندگی کیسی صاف ستھری اور سادہ تھی۔ اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جو کھانا انہیں میسر آتا تھا پورے کا پورا کبھی نہ کھاتے تھے۔ بلکہ اس میں سے دوسرے مستحق لوگوں کا حصہ نکال کر پھر خود کھاتے تھے۔ ان کی زندگی کے حالات جمع کرنے والے عالموں نے لکھا ہے سعدی اپنی روٹی کے تین حصے کرتے تھے، ایک حصہ خود کھاتے تھے ایک حصہ دروازے پر آنے والے فقیر کو دیتے تھے اور ایک حصہ ایسے مزدور کی نذر کرتے تھے جو محنت مزدوری کرنے کے باوجود تنگ دست ہوتا تھا۔

سچا اطمینان اور حقیقی مسرت حاصل کرنے کے سلسلے میں بزرگوں نے ایک زریں اصول یہ بتایا ہے کہ خود سے اونچا درجہ رکھنے والے لوگوں کی نقل کرنے اور حریص بننے کی بجائے انسان کو چاہیئے ان لوگوں کی طرف نظر رکھے جو اس سے بھی زیادہ پست حالت میں ہوں سعدی اس اصول پر بھی پوری طرح عامل تھے۔

کہتے ہیں ایک بار وہ دمشق کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو وہاں کسی نے ان کے جوتے چرا لئے۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن جب وہ دمشق کے بازار سے ننگے پاؤں گذر رہے تھے تو ان کے ذہن

پر اس حادثے کا بہت بوجھ تھا۔ وہ سوچ رہے تھے ایسے پُر رونق بازار میں مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑ رہا ہے۔ اسی حالت میں اچانک ان کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے دونوں پاؤں کسی حادثے میں کٹ گئے تھے، اس اپاہج کو دیکھتے ہی سعدی کے ذہن کی کیفیت بدل گئی انہوں نے اس بات کے لئے سچے دل سے اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔ کہ میرے پیر تو سلامت ہیں جن سے میں چل پھر سکتا ہوں۔ جبکہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پیروں ہی سے محروم ہیں۔

دانائی :

سعدی کو اللہ پاک نے یہ صفت عطا کی تھی کہ وہ ہر بات کی اصلیت کو فوراً پا لیتے تھے۔ اور ہر معاملے کو سلجھانے کے لئے ایسی تدبیر بتاتے تھے۔ کہ بالکل ٹھیک ثابت ہوتی تھی۔ ان کی دانائی اور معاملہ فہمی کی بہت سی حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہم ایک حکایت یہاں درج کرتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک امیر اپنے مصاحبوں اور نوکروں چاکروں سمیت کشتی میں بیٹھا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ سعدی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ دریا کی سطح پُرسکون اور موسم بے حد خوشگوار تھا۔ مگر اس امیر کے ایک ملازم نے سارا لطف کرکرا کر رکھا تھا۔ اس دن سے پہلے وہ شخص کبھی کشتی میں نہ

بیٹھا تھا اس لئے ڈر رہا تھا اور اس کے چیخنے چلّانے سے ہر شخص بیزار ہو رہا تھا۔ امیر نے کہا سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا علاج کیا جائے!

امیر کی یہ بات سن کر سعدی نے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آسانی سے اس کا علاج کر سکتا ہوں۔ امیر نے فوراً اجازت دے دی۔ سعدی نے امیر کے دوسرے نوکروں کو حکم دیا۔ اس شخص کو اٹھا کر دریا میں پھینک دو!

نوکروں نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی، دریا سے ڈر کر چیخنے والے ملازم کو کشتی سے نیچے پھینک دیا اور وہ غوطے کھانے لگا سعدی خاموش بیٹھے اس کی حالت دیکھتے رہے۔ جب وہ شخص کئی غوطے کھا چکا تو نوکروں کو حکم دیا۔ اب اسے پانی سے نکال لو۔ ان کے اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔

امیر حیران تھا کہ اس دانا بینا شخص نے یہ کیسا عجیب و غریب علاج کیا ہے۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ اب وہ ملازم بالکل خاموش بیٹھا ہے تو سعدی کے بارے میں اسے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ اس نے کہا آپ کی اس ترکیب سے مطلوبہ فائدہ تو حاصل ہو گیا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیا علاج تھا؟

سعدی نے جواب دیا۔ دراصل یہ شخص آج سے پہلے کشتی میں سوار نہ ہوا تھا اس لئے دریا سے خوفزدہ تھا۔ میں نے اس کا یہ ڈر دور

کرنے کے لیے اسے دریا میں پھینکوایا تھا۔ اور اب آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس کا سارا خوف دور ہو گیا ہے۔

امیر سعدی کی اس دانائی پر عش عش کر اُٹھا۔

باکمال شاعر

سعدی دنیا کے ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جنہیں ان کی زندگی میں مقبولیت کا درجہ حاصل ہوا اور موت کے بعد بھی اُن کی شہرت، مقبولیت اور کمال کی وجہ سے ان کا نام سب سے پہلے لکھنا پڑتا ہے۔

اس عالمگیر شہرت اور مقبولیت کے علاوہ سعدی کا بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو صرف دل بہلانے اور سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے اچھی باتیں پھیلانے اور لوگوں کی بگڑی ہوئی عادتیں ٹھیک کرنے کا کام لیا۔ ان کی شاعری سراسر اخلاقی شاعری ہے اور انہوں نے اپنے شعروں میں ایسے حکیمانہ نکتے بیان کئے ہیں کہ اگر کوئی شخص انہیں اچھی طرح سمجھ لے اور ان پر عمل کرے تو اسے زندگی کی سچی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

کسی شاعر کے شعروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں اور وہ انہیں ضرب الامثال کے طور پر بیان کریں۔

سعدی کے شعروں میں یہ خوبی کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ کئی سو سال گذرنے کے باوجود ان کے اتنے شعر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں کہ دنیا کا کوئی اور شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سعدی کی قبولیت اور شہرت کے سلسلے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں اس زمانے کے ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا۔ اچانک آسمان کے دروازے کھل گئے اور فرشتے نور سے بھرے ہوئے طبق لیے زمین پر اترنے لگے۔ یہ عجیب ماجرا دیکھ کر ان بزرگ نے ایک فرشتے سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ آج سعدی کا ایک شعر اللہ پاک کی بارگاہ میں قبول ہو گیا ہے اور یہ برکتیں اسی خوشی میں زمین پر نازل کی جا رہی ہیں۔

یہ خواب دیکھ کر ان بزرگ کی آنکھ کھلی تو وہ اسی وقت سعدی کے گھر پہنچے، وہاں انہوں نے یہ منظر دیکھا۔ چراغ روشن ہے اور سعدی جھوم جھوم کر وہی شعر پڑھ رہے ہیں جو انہوں نے فرشتے کی زبان سے سنا تھا۔

وہ شعر یہ ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس کا مطلب یہ ہے:

ہوش مند اور عاقل لوگوں کی نظروں میں درختوں کے سبز پتے
ایسے اوراق ہیں جو اپنی اپنی جگہ اللہ پاک کی معرفت
کا ایک ایک دفتر ہے۔

اگر ہم غور کریں تو سعدی کے اچھے شعروں کی برکت سے نور سے بھرے ہوئے طبق آج بھی آسمان سے نازل ہو رہے ہیں۔ جب ہم یہ اچھے شعر پڑھتے ہیں تو ہمارے دلوں میں اللہ پاک کی عظمت پیدا ہوتی ہے اس کے سچے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پیدا ہوتی ہے، ماں باپ کا درجہ ظاہر ہوتا ہے اور دوسروں سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

بُرے آدمی ہر اچھی چیز کو خراب اور مشکوک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس قاعدے کے مطابق بعض شیطانوں نے سعدی کو بھی بدنام کرنے کی کوشش ہے، کچھ گندے گندے شعر لکھ کر ان کے کلام میں شامل کر دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ پاک نے عقل دی ہے۔ وہ صاف فرق محسوس کرتے ہیں کہ یہ سعدی کا کلام ہے اور یہ کسی اور نے ان کے نام سے وابستہ کر دیا ہے۔

یہ کتاب پڑھنے والے بچے جب بڑے ہوں گے تو انہیں یہ فرق

خود محسوس ہو گا۔ اس عزت والے ایرانی بزرگ کی زندگی کے حالات ہم اس بات پر ختم کرتے ہیں۔ کہ ہمیں ان کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہئے اور یہ بات اپنے دلوں میں بٹھا لینی چاہئے۔ کہ جو لوگ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کی راہ چلتے ہیں، محنت مشقت کر کے علم حاصل کرتے ہیں اور پھر بنی نوع انسان کی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیتے ہیں اللہ پاک انہیں دنیا میں ہر طرح کی کامیابیاں عطا فرماتا ہے، نہ ختم ہونے والی شہرت سے نوازتا ہے اور آخرت میں جنت کے باغوں میں داخل فرماتا ہے جو اس کا سب سے بڑا انعام ہے۔

اللہ پاک ہمیں ایسا ہی اچھا بننے کی توفیق عطا کرے، آمین!

حضرت مجدد الف ثانی

مجدد عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے کسی چیز کو نیا کرنے والا، مذہبی زبان میں مجدد اس بڑے عالم کو کہتے ہیں جو اپنی قابلیت سے ان خرابیوں کو دور کر دے جو مذہب میں پیدا ہو گئی ہوں اور سچے اور بالکل صحیح اصولوں کو پھر لوگوں کے سامنے لے آئے۔

ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ جب سے دنیا بنی ہے نیکی اور بدی کی جنگ جاری ہے، انسانی نسل کا سب سے بڑا دشمن شیطان یہ چاہتا ہے۔ کہ تمام انسان برائی کے راستے پر چلنے لگیں اور اس طرح ان سے وہ عزت چھن جائے جو اللہ پاک نے اپنا خلیفہ بنا کر اسے دی ہے یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے شیطان اور اس کے ساتھی سب سے

زیادہ زور اس بات پر صرف کرتے ہیں۔ کہ مذہب کی باتوں میں کھوٹ شامل ہو جائے اور اس طرح خیر و برکت کا باعث بننے کی جگہ یہ الٹا تباہی کا سبب بن جائے۔ ہماری دنیا میں مذہب کے نام پر جو خون خرابا ہوتا رہا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بنی ہوئی ہے اس کا اصل سبب یہی ہے۔

اوروں کی بات چھوڑیئے ہم مسلمانوں میں مختلف فرقوں کے اندر جو نفرت اور دشمنی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے اسلام کی اصلی اور سچی باتوں کو چھوڑ کر بہت سی رسموں اور رواجوں کو اصل مذہب بنا لیا ہے اور اس برائی کے نتیجے میں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔

دوسری قوموں کے لوگوں نے تو اس سلسلے میں یہاں تک زیادتی کی ہے۔ کہ اللہ پاک نے ان کی رہنمائی کے لئے جو کتابیں نازل کی تھیں۔ ان تک کو بدل ڈالا اور ان کے اچھے اصولوں کی جگہ اپنی خرابیوں کو اپنا مذہب بنا لیا جن کے مٹانے کے لئے رسولوں نے دن رات تکلیفیں اٹھائی تھیں۔

ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم چونکہ آخری نبی اور قرآن آخری الہامی کتاب ہے۔ اس لئے اللہ پاک نے یہ ذمہ

لیا ہے۔ کہ قرآن اور اسلام کے سچے اصول قیامت تک اصلی حالت میں رہیں گے۔ انشاء اللہ قیامت تک ایسے عالم پیدا ہوتے رہیں گے جو ان غلط باتوں کو چھانٹ کر الگ کر دیں گے جنہیں مذہب کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ گمراہ صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے دلوں میں کھوٹ ہو گا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایسی عزت والے عالموں میں سے ہیں جس زمانے میں آپ پیدا ہوئے اس میں مسلمانوں نے شیطان کی پھیلائی ہوئی بہت سی باتوں کو مذہب کا حصہ بنا لیا تھا خاص طور سے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں میں تو بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان خرابیوں میں ایک بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ پہلے بگڑے ہوئے مذہبوں کے ماننے والوں کی طرح ان لوگوں نے بھی قولی عبادتوں ہی کو

ل اسلام نے یہ بات ضروری قرار دی ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ مثال کے طور پر کوئی ظالم کسی کمزور و بے گناہ کو ستا رہا ہو تو اُسے روکیں۔ کہیں بے انصافی ہو رہی ہو تو اُسے دور کریں۔ اگر خدا نے مال و دولت دیا ہو تو اُسے بھلائی کے کاموں میں خرچ کریں۔ نیکی کی باتیں دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ اور اس طرح کے تمام اچھے کام عبادت میں شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص صرف زبان سے اللہ اللہ کرتا رہے بھلائی کے کاموں میں حصہ نہ لے تو اس کے اس فعل کو قولی عبادت کہیں گے۔

اصل دین سمجھ لیا تھا اور یہ خیال کرنے لگے تھے کہ اللہ پاک صرف ان لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو دنیا کے کاموں کو چھوڑ کر صرف عبادت کرتے رہیں۔

اس طریقے یا مسلک کو تصوف کہتے ہیں اور جو لوگ اسے اپناتے ہیں انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ اور اصل تصوف اسلام سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی خالص صورت ہے۔ شروع زمانے میں ان لوگوں کو صوفی کہا جاتا تھا جو پکے سچے مسلمان ہوتے تھے، یہ بزرگ پوری پوری توجہ اور محنت سے اپنے دنیاوی فرائض بھی ادا کرتے تھے اور اللہ پاک کی عبادت بھی کرتے تھے لیکن جب دوسرے بگڑے ہوئے مذاہب کی باتیں اپنا لی گئیں تو تصوف اور رہبانیت اور سادھوؤں کے طریقے میں کوئی فرق نہ رہا۔

ہمارا خیال ہے یہ کتاب پڑھنے والے بچے جانتے ہوں گے۔ عیسائیوں میں کچھ لوگ دنیا کے کاموں کو بالکل چھوڑ کر خانقاہوں اور گرجوں میں رہنے لگتے ہیں اور اپنی ساری زندگی عبادت میں گزار دیتے ہیں۔ ایسے مردوں کو راہب اور عورتوں کو راہبہ کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ہندو مذہب کو ماننے والے کچھ لوگ دنیا سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور ساری زندگی گیان دھیان

یعنی عبادت میں گذار دیتے ہیں۔ انہیں سادھو کہتے ہیں۔

یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے لوگ ذاتی طور پر کیسے بھی اچھے بن جاتے ہوں لیکن انسانی برادری کے لئے مفید نہیں رہتے، مفید ہونا ایک طرف الٹا بوجھ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے کماتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر ایسے لوگوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ یہ لوگ خانقاہوں اور تکیوں میں ہو حق کرتے رہتے تھے، اس دنیا کو اچھا بنانے اور اچھا رکھنے کے لئے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ نہ اس طریقے سے عبادت کرتے تھے جو اسلام نے بتایا ہے۔

اصلاح کی کوشش:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ساری باتوں کا اندازہ کر کے ان بگڑے ہوئے صوفیوں اور درویشوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، آپ نے ان لوگوں کو سمجھایا سچا صوفی اور سچا درویش وہی ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی اور رہنما سمجھے اور قرآن شریف اور حدیث کے حکموں کے مطابق زندگی گذارے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا اس زمانے میں صوفی بالکل بے عملی

کی زندگی گذارتے تھے۔ آپ نے اپنی کوششوں سے اس ماحول کو بدل دیا، صوفی جو مولوی کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے تھے اور اللہ پاک کی ذات اور صفات کے بارے میں فضول قسم کی بحثوں میں الجھے رہتے تھے اپنی غلطیوں سے آگاہ ہو گئے اور قرآن شریف کے احکامات کے مطابق اسلام کی اچھی باتیں دوسروں تک پہنچانے اور ان پر عمل کرانے کے مفید کام میں لگ گئے۔

اس سلسلے میں آپ نے اپنے مختلف مریدوں اور عقیدت مندوں کے نام بہت سے خطوط لکھے۔ ان خطوط میں نہایت عمدہ طریقے سے اسلام کی تعلیم دی گئی ہے۔ انہیں آپ کے مکتوبات کہا جاتا ہے۔ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی ان مکتوبات کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔

صوفیوں اور مولویوں کا اختلاف مٹانے کے علاوہ حضرت مجددؒ صاحب نے ایک اور بڑا کارنامہ یہ انجام دیا۔ کہ حکومت کے بڑے بڑے افسروں کو اور خود بادشاہ کو اسلام کی اچھی باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس زمانے میں ایک اور بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی۔ کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کا اختیار تھا وہ اسلام سے تقریباً کٹ گئے تھے۔ اپنے مقدس مذہب کی تعلیم کے خلاف ان لوگوں نے عیش و عشرت کی زندگی اختیار کر لی تھی اور اپنے بڑھے ہوئے اخراجات

پورے کرنے کے لئے وہ عام مسلمانوں کو اسی طرح لوٹتے اور لوگوں کو اسی طرح ستاتے تھے جس طرح غیر قوموں کے حاکم اپنی رعایا کو لوٹتے تھے۔

شہنشاہ اکبر کے نئے مذہب دین الٰہی کی وجہ سے اس خرابی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ یہ شہنشاہ ذاتی طور پر بے حد قابل، بہادر اور دوراندیش تھا۔ لیکن مذہب کے معاملے میں اس کا عقیدہ پختہ نہ رہا تھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس نے مذہب کو بھی ایک ایسی چیز سمجھ لیا تھا جسے اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

دراصل شروع ہی سے اس خیال کے لوگوں کا ایک گروہ چلا آ رہا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب ہمارے دنیاوی معاملات کو ٹھیک کرنے اور ٹھیک رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اپنی نادانی سے یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ مذہب انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ان پاکیزہ اصولوں کا نام ہے جو اللہ کے سچے رسول لے کر آئے۔ ان اصولوں میں نہ کچھ بڑھایا جا سکتا ہے نہ کچھ گھٹایا جا سکتا ہے۔ ان کے مجموعے کو شریعت کہتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ ایک نیا دین ایجاد کر کے اس ملک میں بسنے والی قوموں کو ایک قوم بنایا جا سکے گا اور اس

طرح یہاں ایک مضبوط سلطنت قائم کی جا سکے گی۔ چنانچہ یہی مقصد حاصل کرنے کے لئے اس نے ہندومت اور اسلام کے اصولوں کو ملاکر دینِ الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب بنایا اور اس بات کے لئے پوری پوری کوشش کی۔ کہ رعایا اس مذہب کو اختیار کرے۔ اس مذہب کی رو سے بادشاہ کی ذات سب سے زیادہ عزت والی تھی۔ اور ہر شخص کے لئے ضروری تھا۔ کہ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ ادب کرے اور اس کے حکموں پر چلے۔

جن لوگوں کے دلوں میں لالچ تھا یا جو بادشاہ سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا لیکن اپنے مذہب کو پوری طرح سمجھنے والوں نے اُسے نفرت کی نظر سے دیکھا۔

اکبر بہت طاقتور بادشاہ تھا۔ اس کی مخالفت کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں کا ایمان کامل تھا انہوں نے اس نئے مذہب کو ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اس انکار کی وجہ سے کافی نقصان اٹھایا۔

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔ یہ شہنشاہ دینِ الٰہی کا پیرو نہ تھا۔ لیکن ادب آداب کے سلسلے میں اس نے بھی بہت سی غیر اسلامی باتیں اختیار کئے رکھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

نے اس بادشاہ کے زمانے میں اصلاح و تبلیغ کا کام شروع کیا۔

جہانگیر سے مقابلہ:

اپنا اور اپنی بادشاہت کا رعب رکھنے کے لئے اکبر نے یہ بات ضروری قرار دی تھی کہ اُس کے سامنے آنے والے لوگ گردن جھکا کر آئیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے دربار میں آنے کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ بنایا گیا تھا۔ یہ دروازہ اِس قدر نیچا تھا۔ کہ معمولی قد کا آدمی بھی سر جھکائے بغیر نہ گذر سکتا تھا۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے بھی اس دروازے کو باقی رکھا اور یہ بات ضروری قرار دی۔ کہ بادشاہ کے سامنے کسی کا سر اونچا نہ رہے۔

یہ بات اسلام کی تعلیم کے بالکل خلاف تھی۔ ہمارے مقدس مذہب کی یہ تعلیم دی ہے کہ عبادت کے قابل صرف اللہ پاک کی ذات ہے ہمیں اُسی کے سامنے سر جھکانا چاہیئے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے سب انسان برابر ہیں۔ عزت کے قابل وہ ہے جو بھلائی اور نیکی کے کام زیادہ کرتا ہے۔

اس اچھی تعلیم کے مطابق حضرت مجدد صاحب نے اس طریقے کی مخالفت فرمائی اور بادشاہ سے یہ کہا یہ جہالت کے زمانے کی باتیں

چھوڑ کر اللہ اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے احکام کے مطابق زندگی گذارو!

اگر یہ بادشاہ آپ کی یہ بات مان لیتا تو اُسے سچی عزت نصیب ہوتی اور اللہ پاک اس کی سلطنت کی جڑیں جما دیتا لیکن اس نے یہ اچھا مشورہ قبول نہ کیا۔ وہ الٹا ناراض ہو گیا۔ اُس نے خیال کیا حضرت نے میرے خلاف بغاوت کر دی ہے۔

بادشاہ کے ناراض ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ بھی ہوئی۔ کہ اس کے دربار کے بعض برے امیروں نے اُسے حضرت مجدد صاحب کے خلاف بھڑکایا۔ ان لوگوں نے پروپاگنڈہ کیا۔ مجدد صاحب مغلیہ سلطنت کو مٹا کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امیر شیطان کے راستے پر چلنے والے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد عام لوگوں کو لوٹنا کھسوٹنا اور عیش عشرت میں غرق رہنا تھا۔ اسلام کی باتوں پر عمل کیا جائے تو ایسی بے ضابطگیوں اور ظلم و ستم کی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ ان امیروں نے اسی وجہ سے مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت کی۔

فقیر کی طاقت:

ان برے اور ظالم امیروں وزیروں کے بھڑکانے کی وجہ سے

شہنشاہ جہانگیر نے یہ فیصلہ نہ کر لیا کہ حضرت مجدد صاحب کو گرفتار کر لیا جائے لیکن ایک بہت بڑا بادشاہ ہونے کے باوجود وہ آپ کو گرفتار کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس کے درباری امیروں میں بعض نیک دل امیر حضرت مجدد صاحب کے مرید تھے۔ ان میں خان خاناں، خان جہاں لودھی اور مہابت خاں کے نام خاص ہیں۔ یہ تینوں بہت بڑے بڑے عہدوں پر مقرر تھے اور ان تینوں ہی کو حضرت کی ذات سے بہت عقیدت تھی۔ بادشاہ اس بات سے ڈرا۔ کہ اگر ان تینوں نے بغاوت کر دی تو سلطنت کا انتظام تباہ ہو جائیگا۔

آخر خوب سوچ بچار کے بعد جہانگیر نے ایک ترکیب کی۔ اس نے ان تینوں امیروں کو سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا۔ خان خاناں کو دکن، خان جہاں لودھی کو بنگال اور مہابت خاں کو کابل۔ اب میدان صاف تھا۔ دربار میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حضرت مجدد صاحب کا حامی ہوتا۔

۱۶۱۹ء میں جہانگیر نے حضرت مجدد صاحب کے نام حکم بھیجا کہ آپ ہمارے دربار میں حاضر ہوں۔ حضرت مجدد صاحب اس حکم پر دربار میں تشریف لے گئے۔ لیکن آپ نے اس دروازے میں سے گذرنا پسند نہ کیا جس میں سے ہر شخص کو گذرنا پڑتا تھا۔ آپ نے

ایک سچے مومن کی شان کے مطابق بادشاہ کو نصیحتیں کیں اگر جہانگیر
کے دل میں آپ کے خلاف شک پیدا نہ کر دیا جاتا تو شاید وہ آپ
کی ان باتوں پر عمل کرتا لیکن ان حالات میں اس نے آپ کی باتوں
کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور گوالیار کے قلعے
میں قید کر دیا۔

قید خانے میں روشنی :

اللہ کے نیک بندوں کی مثال اس شمع کی سی ہوتی ہے جو ہر جگہ
روشنی پھیلا دیتی ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ بادشاہ
کے محل میں روشنی کی گئی ہے۔ یا کسی غریب کی جھونپڑی میں حضرت
مجدد صاحب کو گوالیار کے قلعے کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے قید
کر دیا گیا تو آپ نے وہاں بھی نیکی پھیلانے کا کام جاری رکھا۔ حضرت
یوسف علیہ السلام کی طرح آپ قیدیوں کو اسلام کی اچھی اچھی باتیں
بتاتے اور نیکی کی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے۔ اس کوشش
کا یہ نتیجہ نکلا کہ بہت سے قیدیوں نے شریفانہ چال چلن اختیار کر لیا۔
گویا آپ کی برکت سے قید خانے کی اندھیری کوٹھڑیوں
میں نیکی کا نور پھیل گیا۔

مجدد صاحب کی بہادری:

جس زمانے میں قید تھے آپ کے بہت سے عقیدت مندوں نے یہ مشورہ دیا کہ محض بادشاہ کا شک مٹانے کے لئے اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسی طریقے سے بادشاہ کی تعظیم کر لیجئے جو اس نے مقرر کیا ہے۔ ان لوگوں نے یہ دلیل بھی دی کہ اسلام نے جان بچانے کی تاکید کی ہے اور اس بات کو جائز بتایا ہے۔ کہ کسی ظالم کے سامنے بے بس ہو جائیں یا زندگی کو خطرے میں ڈالنے والی کوئی اور مجبوری آ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے اپنے اصول کو چھوڑ دیں۔ کہتے ہیں ولی عہد سلطنت شاہجہان جو اس وقت شہزادہ خرم کہلاتا تھا حضرت سے ملنے گوالیار کے قلعے میں گیا بادشاہ کو خوش کرنے کی ترغیب دی لیکن آپ نے یہ بات نہ مانی، فرمایا۔ اجازت ضرور ہے لیکن افضل و اعلیٰ بات یہ ہے کہ ہر حالت میں اپنے اصول کی حفاظت کی جائے۔:

مہابت خاں کی بغاوت:

ہم یہ بات پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ مغلیہ دربار کا بہت بڑا رکن

مہابت خاں حضرت مجدد صاحب کا مرید اور خلیفہ تھا اور بادشاہ نے اسی وجہ سے اسے کابل کا گورنر بنا کر دور دراز بھیج دیا۔ جب اس نے اپنے مرشد کی گرفتاری کا حال سنا تو فوج لے کر آگرے کی طرف چل پڑا۔ ادھر سے جہانگیر بھی مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں فوجیں اٹک دریا کے کنارے آمنے سامنے ہوئیں۔ جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ میں مہابت خاں جیت گیا۔ اس نے جہانگیر کو قید کر لیا بلکہ نور جہاں کی دانائی سے بادشاہ کو آزادی نصیب ہوئی۔ یہ واقعات ۱۶۱۹ء کے ہیں۔

بادشاہ کی غلط فہمی دور ہو گئی:

کسی نے بالکل سچ کہا ہے، سچائی کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا۔ بالآخر شہنشاہ جہانگیر کو یہ بات معلوم ہو گئی۔ کہ حضرت مجددؒ صاحب میرے اور میرے خاندان کے دشمن نہیں ہیں بلکہ آپ صرف ان برائیوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ جو مسلمان قوم میں عام طور سے پیدا ہو گئی ہیں اور جن کی وجہ سے یہ قوم اللہ پاک کی رحمت سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ حضرت کے خلاف جو باتیں پھیلائی گئی ہیں۔ وہ سب من گھڑت ہیں۔ چنانچہ سچائی سے آگاہ ہوتے ہی شہنشاہ نے

حضرت کو آزاد کر دیا اور پھر آخیر تک اپنے ساتھ رکھا اور آپ کے مشورے پر عمل کر کے بہت سی برائیوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں یقین ہے مغلیہ خاندان کے اس بادشاہ نے مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے کے سلسلے میں جو نیک نامی حاصل کی اور اسی طرح کے جو اور اچھے کام کیئے وہ حضرت صاحب ہی کی نصیحتوں کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ شروع زندگی میں شہنشاہ جہانگیر خوب عیش عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا اور دین کے کاموں کی طرف سے بہت بے پروا تھا۔

ایک اچھّا نتیجہ:

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے یہ واقعات پڑھ کر ہمیں کامیابی کا ایک نہایت عمدہ گر معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کو بُرا بھلا کہہ کر انہیں اپنا دشمن بنا لینے کی جگہ اصلاح اور تبلیغ کا ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ان کے قریب ہو کر انہیں نیکی اور بھلائی کی باتیں سمجھائی جائیں — ہاں اس سلسلے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ دوسروں کو ہم خیال بنانے کے جوش میں انسان اپنا مسلک نہ چھوڑے۔

دراصل یہی وہ طریقہ ہے جس پر چل کر ہمارے آقا اور اللہ کے

سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی اچھی باتیں پھیلائیں۔ آج اسلام کے بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہیں۔ کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اخلاق کی طاقت سے پھیلا ہے:

مجدد صاحب کا خاص مقصد:

حضرت مجدد صاحب نے اپنی زندگی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ حجروں میں بیکار بیٹھ کر مفت کی روٹیاں کھانے والے پیروں اور درویشوں کو یہ بات سمجھائی۔ کہ جب تک تم لوگ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے پر نہیں چلو گے۔ اس وقت تک تمہاری نجات نہ ہوگی۔ آپ کی پاکیزہ تعلیمات کی وجہ سے تکیوں اور خانقاہوں کی حالت سدھر گئی اور یہ بیکاروں کے گڑھ بننے رہنے کی جگہ بھلائی کے مرکز بن گئے۔ شریعت اسلامی سے منہ موڑ کر ادھر ادھر بھٹکنے والے پیروں فقیروں نے اسلام کے سچے اصولوں کو اپنایا اور اسلام کی ترقی کے بہت سے کام کیے۔

ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ آج اس ملک میں اسلام کی جو روشنی نظر آرہی ہے وہ بڑی حد تک آپ ہی

کی کوشش اور قابلیت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اور آپ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کا اثر دور کر کے اسلام کے سچے اصولوں کو نکھارا اور لوگوں کو ان اصولوں پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا۔

خاندانی حالات:

آخیر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ صاحب کے کچھ خاندانی حالات بھی بتا دئے جائیں تاکہ آپ کی مبارک ذات سے پوری طرح واقفیت ہو جائے۔

حضرت مجددؒ صاحب کا سلسلہ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ آپ کے پانچویں دادا حضرت امام رفیع الدین نے اس بستی کو آباد کیا تھا جس کا نام سرہند ہے اور جہاں آپ کا مزار مبارک ہے۔ یہ بستی مشرقی پنجاب (بھارت) میں ہے۔

آپ کے دادا صاحب کا نام شیخ زین العابدین اور والد صاحب کا اسم گرامی شیخ عبدالاحد ہے۔ آپ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو دنیا میں تشریف لائے۔ ماں باپ نے آپ کا نام احمد رکھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل

کی۔ آپ ایسے ذہین تھے۔ کہ صرف سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ حدیث اور دوسرے اسلامی علوم مولانا قادری بہلول بدخشانی اور مولانا کمالی کشمیری سے حاصل کیے۔

ظاہری علوم میں کامل ہونے کے بعد باطنی یا روحانی علم حاصل کرنے کے لیے حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے، جن کی درگاہ دلی میں ہے۔

آپ کی شادی تھانیسر کے ایک رئیس شیخ سلطان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ۳۵ سال کی عمر میں آپ نے حج کا ارادہ کیا۔ اس سفر کے دوران دہلی ٹھہرے اور خواجہ باقی باللہ کی بیعت کی۔ حج سے فارغ ہو کر اسلام کی تبلیغ اور قوم کی اصلاح کا کام شروع کر دیا اور آخری وقت تک یہ فرض انجام دیتے رہے۔

ایک روایت کے مطابق ۹۔ ربیع الاول ۱۰۹۰ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کی زندگی نہایت سادہ اور نیکیوں سے بھری ہوئی تھی اگرچہ بڑے بڑے امیر اور کئی شاہزادے آپ کے مرید تھے لیکن کسی سے روپے پیسے کی امداد نہیں لی ہمیں دعا کرنی چاہیے۔ اللہ پاک ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین ہ

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان بزرگوں میں ہے جنہوں نے مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی سربلندی کے لئے دن رات کوشش کی اور اللہ پاک نے ان کی اس کوشش کو قبول بھی فرمایا یعنی وہ مقصد بڑی حد تک پورا ہوا جو ان کے پیش نظر تھا۔
جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کی کتابوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی ہے انہیں یہ بات معلوم ہو گی کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو دنیا سے ظلم اور بے انصافی کا خاتمہ کرتا ہے اور نیکی کا راستہ دکھا کر انسانوں کو سچی عزت دیتا ہے۔ جس گروہ یا جس شخص نے بھی اس مقدس مذہب کے اصولوں کو اپنایا اُسے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوا

اس کی زندگی ہر لحاظ سے کامیاب زندگی بن گئی اور اسے دنیا اور عقبیٰ دونوں میں سرخروئی حاصل ہوئی۔

تاریخ کی کتابیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ کہ مسلمان قوم جب تک ان اچھے اصولوں پر عمل کرتی رہی سربلند اور ممتاز رہی۔ اُسے حکومت کی طاقت اور قوموں کی امامت کا منصب دیا گیا لیکن بدقسمتی سے ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ کہ خود مسلمانوں نے ہی ان اچھے اصولوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا بلکہ اس سے بھی بڑی برائی یہ کی کہ اسلام کے نام پر بہت سی غیر اسلامی باتوں کو اپنا لیا اور قریب قریب اسی انداز سے زندگی گذارنے لگے جس طرح کافر قوموں کے لوگ زندگی گذارتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کے آخری زمانے میں برصغیر ہند و پاک کے مسلمان اس برائی میں بہت بڑھ گئے تھے۔ ان کے اندر اس قدر خرابیاں آگئی تھیں۔ کہ اگر بروقت انہیں دور کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو شاید اس ملک سے اسلام کا نام ہی مٹ جاتا۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ کوشش حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ آپ نے نہایت جرأت اور قابلیت کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشاندہی کی، لوگوں کو برائی اور بھلائی کا

کا فرق سمجھایا اور اس بات کا احساس دلایا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنوارا تو تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ چنانچہ آپ کی ان کوششوں سے مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے اسلام کی تعلیم کو پھیلانے اور کھوٹ سے پاک کرنے کے لئے بھرپور کوشش کی۔

خاندان :

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نسلی تعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے۔ تحقیق کرنے والے عالموں کی رائے کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ کی ساتویں یا آٹھویں پشت سرزمین عرب سے نکل کر عجم میں آباد ہوئی۔

قریب کے بزرگوں میں آپ کے دادا صاحب کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان کا اسم گرامی حضرت شاہ وجیہہ الدین تھا اور آپ مشہور مغل شہنشاہ حضرت اورنگ زیبؒ عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے۔ اس زمانے کے حالات اور معاشرت ہمارے موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھی۔ ہندوستان پر حکومت تو بیشک مسلمانوں ہی کی تھی۔ لیکن اندرونی طور پر وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے اور ان کی کمزوری کی وجہ سے غیر مسلم قومیں اس کوشش میں مصروف ہو گئی تھیں کہ اس ملک کی

حکومت پر خود قبضہ کرلیں۔ ان کے علاوہ خود مسلمانوں میں بہت سے نواب اور جاگیردار یہ چاہتے تھے۔ کہ مغل خاندان کی جگہ سارا اختیار انہیں مل جائے شہنشاہ اورنگ زیبؒ نے ان حالات میں حکومت کے اختیارات سنبھالے اور یہ بات محسوس کی۔ کہ اگران شورشوں کو پوری طرح نہ دبایا گیا تو نہ صرف مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ اس ملک میں بسنے والی مسلمان قوم ہی خطرے میں پڑ جائے گی چنانچہ اس بہادر، زیرک اور اسلام سے محبت کرنے والے بادشاہ نے اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی بھلائی کے لئے بھرپور کوشش کی۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے یہ اندازہ کرنا غلط نہیں کہ حضرت شاہ وجیہہ الدین کا فوج میں شامل ہونا صرف پیٹ پالنے کے لئے نہ ہوگا بلکہ انہوں نے ایک اہم فرض سمجھ کر یہ پیشہ اختیار کیا ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی شاہ عبدالرحیم ہے۔ آپ اپنے زمانے کے بڑے عالموں میں گنے جاتے تھے۔ ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے آپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اللہ پاک نے انہیں کیسا پاکیزہ دل دیا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہو سکتا ہے:

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے مترجم مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔

جس زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیبؒ فقہ اسلامی کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" مرتب کرا رہے تھے حضرت شاہ عبدالرحیم کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ عالموں کے اس بورڈ میں جو فتاویٰ عالمگیری مرتب کر رہا تھا۔ ایک صاحب شیخ حامد بھی تھے۔ جو حضرت شاہ عبدالرحیم کے دوستوں میں تھے، انہیں ان کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو معقول تنخواہ مقرر کر کے مولفین کی جماعت میں شامل کرنا چاہا۔ دیکھا جائے تو یہ ایک غیبی امداد تھی۔ لیکن اپنے خاص خیالات کی وجہ سے شاہ صاحب اس نوکری کو پسند نہ کرتے تھے۔ آپ نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن مجبوری یہ آ پڑی۔ کہ جب نوکری کی پیش کش اور شاہ صاحب کے انکار کا حال آپ کی والدہ صاحبہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ نوکری اختیار کر لینے کا حکم دیا۔ والدہ صاحبہ کی حکم عدولی کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔ اس لئے آپ مجبور ہو گئے کہ یہ سرکاری ملازمت اختیار کر لیں۔ لیکن چونکہ اُسے اپنے اصول کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے آخری چارۂ کار کے طور پر اللہ پاک کے حضور دعا فرمائی۔ کہ تو مجھے اس آزمائش سے بچا لے اور آپ کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی۔ کہ جب آپ کا نام شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے بغیر کسی خاص وجہ کے آپ کا نام کاٹ دیا اور یہ نوٹ لکھا۔ کہ اگر وہ چاہیں تو حصولِ معاش کے لئے جاگیر دی

جا سکتی ہے۔ شاہ صاحب تو پہلے ہی اس نوکری کے خلاف تھے آپ
نے سنا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور جاگیر لینے سے بھی انکار کر دیا۔

انہی عزت والے بزرگ کے ہاں ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کے دن
حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب دلی کے
قریب پھلت نامی موضع میں رہتے تھے۔ آپ کی ولادت وہیں ہوئی۔

ذاتی حالات:

ماں باپ نے حضرت شاہ صاحب کا نام قطب الدین تجویز
کیا تھا لیکن یہ نام مشہور نہ ہو سکا۔ ولی اللہ نام رکھے جانے کی وجہ یہ
بیان کی جاتی ہے۔ کہ آپ بچپن ہی سے بے حد سنجیدہ اور نیک تھے
کھیل کود کی جگہ دین کی باتیں سیکھتے اور اپنی بساط کے مطابق ان
پر عمل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ آپ کی انہی خوبیوں کی وجہ سے
گھر والے آپ کو ولی اللہ کہنے لگے اور یہ نام کچھ ایسا مشہور ہوا۔ کہ
اصلی نام کسی کو یاد ہی نہ رہا۔ ولی اللہ کے لفظی معنی اللہ کا دوست
ہیں۔ ویسے یہ بزرگی کا ایک منصب بھی ہے جو لوگ بری باتوں سے بچ کر
اپنے آپ کو سچا مسلمان بنا لیتے ہیں اور اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں بھلائی کے
کاموں میں صرف کرتے ہیں اللہ پاک انہیں یہ عزت عطا کرتا ہے کہتے

ہیں۔ ایسے لوگوں کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اور اچھے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے والد صاحب سے ہی تعلیم حاصل کی اور اپنی محنت، شوق اور ذہانت کی وجہ سے صرف چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بات بتانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہ اس زمانے میں اس شخص کو فارغ التحصیل قرار دیا جاتا تھا۔ جو فقہ، فلسفہ، منطق، ادب اور کسی حد تک علم طب میں بھی کمال حاصل کر لیتا تھا۔

دینی اصولوں سے آپ کو کس قدر محبت تھی اس کا حال صرف اسی ایک بات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر سے نماز روزے کی پابندی شروع کر دی تھی۔

شادی:

جس وقت آپ کی عمر پندرہ سال ہوئی تو خاندان ہی کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی کر دی گئی۔ اتنی کم عمر میں شادی ہو جانے کی بابت خود شاہ صاحب نے یہ بات بیان کی ہے کہ والد صاحب کو آئندہ پیش آنے والے کئی ایسے واقعات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر ابھی دلوں یہ

فرض انجام نہ دیا جاتا تو بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو جاتیں۔ چنانچہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی دونوں خاندانوں میں بہت سی موتیں ہوئیں اور ان مرنے والوں میں خود حضرت شاہ صاحب کے والد محترم بھی تھے۔ ایسے اندازے کو مذہبی زبان میں کشف، کہتے ہیں۔ یہ روحانی طاقت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان ہر قسم کی برائیوں سے بچ کر اپنی زندگی کو اللہ پاک کے احکام کے سانچے میں ڈھال لے۔

والد صاحب کی جانشینی،

جس وقت آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوا آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اتنی کم عمر میں آدمی اس قابل نہیں ہوتا۔ کہ کوئی بڑی گدی سنبھال سکے لیکن آپ کو اللہ پاک نے غیر معمولی صلاحیتیں دی تھیں۔ علم میں یکتا ہونے کے ساتھ عمل میں بھی کامل تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے لوگوں نے مجبور کیا۔ کہ آپ اپنے والد صاحب کی گدی سنبھالیں اور درس تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں۔ چنانچہ دستار بندی کے بعد آپ نے لوگوں کو دینی اور روحانی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ روحانی تعلیم سے مراد تصوّف کی تعلیم ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے

والد شاہ عبدالرحیم صاحب اس زمانے کے ایک بزرگ شیخ ابوالقاسم کے مرید تھے اور خود حضرت شاہ صاحب نے اپنے والد کی بیعت کی تھی۔

اس موقع پر تصوف کے سلسلے میں ذرا سی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لئے چند باتیں لکھتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مسلمانوں میں شروع سے ایک ایسا طبقہ رہا ہے جس کے افراد دنیاوی باتوں کے مقابلے میں دین کی باتوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کو صوفیوں کا طبقہ یا گروہ کہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اللہ پاک نے ہمیں اس لئے پیدا نہیں کیا۔ کہ کھائیں پئیں اور موج اڑائیں بلکہ اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے اپنا سارا وقت عبادت میں صرف کریں اور دنیا کے مال اسباب سے دل نہ لگائیں۔ یہاں تک تو یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ قرآن پاک میں بھی انسان کی زندگی کا یہی مقصد بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ پاک کی عبادت میں مصروف رہے اور اس کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام جانے لیکن اس سلسلے میں ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہوگئی کہ آگے چل کر اس گروہ کے ایک بڑے حصے نے اسلام کی اور بہت سی باتوں کو چھوڑ دیا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طریقے سے

زندگی گذاری تھی اور جس طریقے کو اپنانے کا حکم دیا تھا اس کے خلاف عیسائی راہبوں کی طرح خانقاہیں اور تکیے آباد کر کے رہنے لگے۔

جس شخص نے اسلام کی تعلیم پر معمولی سا غور بھی کیا ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس مقدس مذہب نے خودداری اور شرافت کی زندگی گذارنے کو خدا پرستی کا ضروری حصّہ قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جائز طریقے سے روزی حاصل کرے اور ان تمام دنیاوی کاموں میں حصہ لے جن سے انسانی برادری کا نظام استوار ہوتا ہے اور تمدن کو ترقی ملتی ہے۔ یہ بات ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ خود تو حجرے میں بند ہو کر اللہ اللہ کرتا رہے اور دوسرے اس کی تمام ضرورتیں پوری کریں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے ہم پر خود ہمارے جسم کا بھی حق ہے۔ عزیز رشتہ داروں کا بھی حق ہے اور خدا کا بھی حق ہے اور سچا مسلمان وہی ہے جو ان تمام حقوق کو ادا کرتا ہے ہمارے جسم کا حق یہ ہے کہ اسے تندرست اور آسودہ رکھنے کے لیے مناسب غذا کھائیں۔ صاف ستھرا لباس پہنیں اور تندرستی کے اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے آرام پہنچائیں۔ عزیزوں کا حق یہ ہے۔

کہ ان کی مناسب امداد کریں۔ مثال کے طور پر بیوی اور بچوں کی ضروریات پوری کریں اور امداد کے مستحق لوگوں کو زکواۃ، صدقات اور قرض کی صورت میں امداد دیں۔ اللہ پاک کا حق یہ ہے کہ زندگی کے کسی لمحے میں بھی اس کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ ہمارا خالق یعنی پیدا کرنے والا ہے اور ہم اس کے بندے ہیں۔

اسی طرح اسلامی عبادت کا مفہوم بے حد مکمل اور وسیع ہے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اگر ایک شخص دن رات میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہے۔ رمضان شریف کے روزے رکھتا ہے۔ مالدار ہونے کی صورت میں زکواۃ نکالتا اور حج کا فرض ادا کرتا ہے تو اس کے پکا سچا مسلمان ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ پھر اس مذہب نے نیکی اور بھلائی کے ہر کام کو عبادت میں شمار کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی مریض کے لئے دوا لا کر دیتا ہے یا کسی کمزور کی امداد کرتا ہے تو اسے ان کاموں کے بدلے اجر ملتا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ ثواب پاتا ہے جو دنیا سے الگ تھلگ تنہا گوشوں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب اور آپ کے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا وہ اسی طرح زندگی گذارتے تھے جس طرح حضرت رسول اللہ نے حکم

دیا ہے، ہاں مرید بننے بنانے کا سلسلہ جاری تھا اور روحانیت کی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن یہ تعلیم عین شریعت کے مطابق ہوتی تھی حضرت شاہ صاحب نے بھی اسی طریقے کو اپنایا۔ آپ دین کی تعلیم بھی دیتے تھے اور عبادت کے وہ طریقے بھی سکھاتے تھے جن پر عمل کر کے وہ خود کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنا سکیں۔

حج کا سفر:

تقریباً دس گیارہ سال درس و تدریس کے سلسلے میں مصروف رہنے کے بعد آپ نے ۱۱۴۳ھ میں فریضہ حج ادا کرنے کا ارادہ کیا اور مریدوں اور عقیدت مندوں کی ایک بڑی جماعت کو ساتھ لیکر سمندری راستے سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں تقریباً ایک سال ٹھہرے اور حدیث کا علم پڑھانے والے مشہور عالموں سے اس علم کی تکمیل کی۔ اس سفر کے ایک سال بعد دوسری بار حج کا فرض ادا فرمایا اور اس کے بعد یکسو ہو کر تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت:

اشارۃً تو یہ بات لکھی جا چکی ہے۔ کہ بارھویں صدی ہجری میں جب

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ ہے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ اگرچہ بظاہر اس ملک پر انہی کی حکومت تھی لیکن یہ سلطنت تقریباً ایسی تھی جیسے گھن کھائی ہوئی لکڑی ہوتی ہے۔ جس طرح ایسی لکڑی اوپر سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے مسلمان بھی مقتدر اور فارغ البال معلوم ہوتے تھے لیکن اندرونی طور پر ان کی حالت بہت خراب تھی۔ جس طرح گھن کھائی ہوئی لکڑی کو معمولی سی ضرب پاش پاش کر دیتی ہے اسی طرح مسلمانوں کا قصرِ اقتدار بے بنیاد تھا۔

حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بے داغ بصیرت اور فولادی عزم سے حکومت کے گرتے ہوئے ستونوں کو استوار کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی مجاہدانہ کوشش ان خرابیوں کا ازالہ نہ کر سکی جو ہندوستانی مسلمانوں کے اخلاق و اعمال میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ بس اتنا ہوا کہ ان کی زندگی تک اس قصر کے در و بام سلامت رہے اور مخالفوں کی کوئی کوشش بڑے پیمانے پر کامیاب نہ ہو سکی۔

بات تو بہت لمبی چوڑی ہے لیکن اختصار کے خیال سے ہم ان خرابیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مختصر طور پر ان کا حال بیان کرتے ہیں اور پھر یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کس قدر کوشش فرمائی اور آپ کی

ان مبارک مساعی کا کیا نتیجہ مرتب ہوا:

۱۔ اس زمانے کے ہندی مسلمانوں میں پہلی اور بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی۔ کہ انہوں نے اسلام کے سچے اصولوں کو چھوڑ کر بہت سی فضول باتوں کو اپنا لیا تھا، وہ بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے ہی کو مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔

۲۔ دوسری بہت بڑی خرابی یہ تھی۔ کہ وہ ان مردانہ اوصاف سے بڑی حد تک محروم ہو گئے تھے جو قوموں کو زندہ رکھتے اور ترقی کی منزل کی طرف بڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سادہ زندگی کی جگہ انہوں نے تکلف اور تعیش کو اپنا لیا تھا۔ ان کا یہ حال تھا۔ کہ معمولی آمدنی والے لوگ بھی شہزادوں کا سا لباس پہننے کی کوشش کرتے تھے۔ ادھار قرض کر کے بھی اپنے گھروں کو خوب سجاتے تھے اور چٹ پٹے کھانوں کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس قدر کاہل اور بے پروا ہو گئے تھے کہ شجاعت، سخت کوشی اور صبر و استقلال کی صفات ان میں نام کو بھی نہ رہی تھیں۔ کہنے کو ان میں بہادری اور شہ زوری کے بڑے بڑے مقابلے ہوتے تھے اور ان کے اکھاڑے خوب آراستہ رہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں محض نمائشی تھیں۔ اپنے بہادر

بزرگوں کی ایک صفت بھی ان میں باقی نہ تھی۔ نہ جرأت کوئی مشکل کام کر سکتے تھے نہ صبر و استقلال اور تدبر سے اپنے مسائل حل کر سکتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے اوپر کے طبقے میں (جو ہر قوم کا جاندار طبقہ ہوتا ہے) زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جن کا گذارہ سرکاری خزانے پہ ہے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے شاہی خزانے کو لوٹتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ روپیہ ان کی عیاشیوں کی نذر ہوتا رہتا ہے جو ملک اور قوم کی بہتری کے کاموں پہ صرف ہونا چاہیئے تھا۔

شاہ صاحب کی اصلاحی کوششیں

ہمارے زمانے کے مشہور عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ایک مقالے میں اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ مسلمان قوم کے لئے جو دور اس قدر زوال کا تھا اس میں شاہ ولی اللہؒ جیسے بالغ نظر عالم کس طرح پیدا ہو گئے۔ اگر غور کیا جائے تو مولانا کی یہ حیرانی اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اللہ پاک نے حضرت شاہ صاحب کی ذات میں اس قدر خوبیاں اکٹھی کر دی تھیں۔ کہ ہر طرح کی سہولت، ماحول کی پاکیزگی اور تعلیم و تربیت کے اعلیٰ اہتمام کے بغیر ان کا یکجا ہونا محالات سے

ہے۔ آپ کی نگاہ دور رس، قوتِ فیصلہ بے داغ اور دل و دماغ خاص
کی روشنی سے جگمگائے ہوئے تھے۔ اور ان سب خوبیوں کے ساتھ
ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کو عمل کی بھرپور قوت ملی تھی۔

ان خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر جب آپ نے اپنے
دَور کے مسلمانوں کی حالت سنوارنے کا عزم فرمایا تو اللہ پاک نے ایسا
سیدھا اور صاف راستہ دکھا دیا اور ایسے اچھے خیالات آپ کے
ذہن میں القا فرمائے کہ مسلمان قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی پھر سلامتی کے
ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ خطرات کے بادل چھٹ گئے اور گنتی کے
چند برسوں میں سچے مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ منظم ہو گیا جس نے
حق و انصاف کی حفاظت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا
اور اپنے فرائض کو ایسی عمدگی سے ادا کیا کہ دورِ اوّل کے مسلمانوں کی
یاد تازہ ہو گئی۔ خدا کے فضل و کرم سے یہ گروہ اب تک موجود ہے اور
اس بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی جو دینی سرگرمیاں
پائی جاتی ہیں وہ حضرت شاہ صاحب کی اصلاحی تحریک کے اثر سے
ہیں۔ چنانچہ انہی وجوہات کی بنا پر آپ کو بھی مجدد تسلیم کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی حالت کو اچھا بنانے کا اعلیٰ مقصد حاصل کرنے
کے لیے آپ نے نہایت مؤثر انداز میں انہی دونوں خرابیوں کو دور

کرنے کی کوشش فرمائی جن کا گذشتہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ وعظ و نصیحت، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو ذریعہ بنا کر آپ نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی جو بارہ تیرہ سو سال سے اس قوم کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے یہ زریں اصول پیش کیا کہ مسلمانوں کے بڑے فرقوں کے لوگ یہ ضد چھوڑ دیں، کہ صرف وہی راہِ راست پر ہیں۔ صاف ذہن کے ساتھ مذہب کی پوری تعلیم پر غور کریں اور ان تمام باتوں کو اپنا لیں جو قرآنِ پاک اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کے مطابق ہوں۔ ایسی باتیں خواہ اپنے فرقے میں ہوں یا کسی اور گروہ میں۔

غور کیا جائے تو یہی وہ سنہری اصول ہے جس پر اس ملت کے تمام فرقے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ پاک نے سمجھ دی ہے وہ یہ بات جانتے ہیں کہ ہماری سب سے بڑی مصیبت آپس کی ضد اور تعصب ہی ہے۔ ہر فرقہ اس بات پر تلا ہوا ہے کہ جب تک پوری قوم انہی باتوں کو ٹھیک نہ مانے گی جنہیں وہ درست کہتا ہے وہ اختلاف کی تلوار بے نیام رکھے گا۔ یہ تعصب اور ضد بالکل ان جاہلوں کی سی ہے جو اسلام کے اقتدار سے پہلے دنیا کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ اپنی اپنی بات

منوانے اور ہر شخص کو اپنی عینک سے دیکھنے پر مجبور کرنے کی جگہ درست
بات یہ ہے۔ کہ قرآن اور حدیث کی طرف توجہ دلائی جائے اور یہ کہا
جائے کہ خود ہمارا یا زید بکر عمر کا کچھ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دین کے
سچے اصول وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے بیان فرمائے ہیں۔ ہمیں چاہیے متحد ہو کر ان اصولوں پر عمل کریں۔
اور یوں قرآن کے اس حکم کو پورا کریں کہ اللہ کی رسی کو مل کر مضبوط پکڑے
رہو۔

چونکہ اللہ پاک نے شاہ صاحب کو غیر معمولی صلاحیتیں دی تھیں
اور آپ بہت بڑی روحانی قوت رکھتے تھے اس لئے آپ کی ان باتوں
کا بہت اثر ہوا۔ سمجھدار لوگ جاہلوں کے تکیوں اور فساد کے اکھاڑوں
سے نکل کر آپ کے حلقۂ درس کی زینت بننے لگے اور قرآن اور حدیث
کی صحیح تعلیم سے اپنے سینوں کو منور کرنے لگے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک خاص نکتہ یہ سامنے رکھا کہ دین کی
باتوں کو زیادہ سے زیادہ آسان انداز میں بیان کیا جائے اور لوگوں
کو یہ سمجھایا جائے کہ مذہب اسلام ان پر کوئی ایسا بوجھ نہیں لادتا جسے
اٹھایا ہی نہ جا سکے بلکہ چند نہایت آسان اور سادہ سادہ سے اصولوں
پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ سب کے سب اصول ایسے ہیں کہ

انہیں اپنانے سے خود ان کی زندگی سنور جائے گی۔ انہیں دنیا میں بھی عزت ملے گی اور آخرت میں بھی سرخرو رہیں گے۔

اس خاص نکتے کی قیمت اس لحاظ سے بہت ہی زیادہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے دین کی باتوں کو بہت ہی مشکل بنا دیا تھا۔ ایک عام آدمی جب ان پابندیوں پر غور کرتا تھا تو اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں ان پر صرف اس صورت میں عمل کر سکتا ہوں کہ دنیا کے سارے کام دھندے چھوڑ دوں اور خود کو ہر قسم کی آسائش سے محروم کر لوں۔ حضرت شاہ صاحب نے اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی ایسے دلنشین انداز میں تشریح کی اور ایسی قابلیت سے فالتو باتوں کو ان سے الگ کیا۔ کہ ہر سمجھدار شخص انہیں عمل کے قابل سمجھنے لگا اور آہستہ آہستہ وہ دہشت کم ہو گئی۔ جو لوگوں کو مذہب سے دُور لے جا رہی تھی۔

طریقِ کار:

یہ بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے حضرت شاہ صاحب نے بحث مباحثے کا کوئی اکھاڑا آراستہ نہیں کیا۔ شہرت، نیک نامی اور دنیاوی فائدوں کے خیال سے الگ ہو کر اور کسی نئے فرقے کی داغ بیل ڈالے بغیر لوگوں کے سامنے قرآن اور حدیث کی سچی باتیں پیش کیں۔ سخت محنت

برداشت کرکے بہت سی کتابیں لکھیں اور ان کتابوں میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ کسی عالم یا کسی درویش یا کسی صوفی کو اپنا رہنما ماننے کی جگہ ہر فرقے کے مسلمان اللہ کے سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نجات دہندہ مانیں اور آپ ہی کے احکام پر سچے دل سے عمل کریں۔

اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ جب بھی کسی شخص نے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی اس کے ماننے والوں کا ایک خاص حلقہ پیدا ہو گیا اور اس طرح دوسروں کو برا بھلا کہنے اور دین کے نام پر لڑائی جھگڑا کرنے والوں کا ایک نیا فرقہ بن کر ان لوگوں نے قوم کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے گرد ایسا کوئی گروہ اکٹھا نہیں ہونے دیا۔ آپ تمام مسلمانوں کے خیر خواہ رہے اور ہر فرقے کے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کی طرف بلاتے رہے۔

یہ فرض انجام دیتے ہوئے آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صدیوں سے اپنے غلط مذہبی عقیدوں پر جمے ہوئے جاہل خم ٹھونک کر آپ کے سامنے آ گئے۔ اپنے بزرگوں کی رسموں اور رواجوں کو ہی اصل دین خیال کرنے والے لوگوں نے بار بار آپ پر حملے کیے لیکن

آپ نے ان میں سے کسی کو اپنا مدِ مقابل خیال نہیں فرمایا۔ جوابی حملہ کرنے کی جگہ ایسے لوگوں کو ذہنی مریض خیال کیا اور ایک ہمدرد طبیب، کی طرح ان کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہے۔

درس و تدریس اور دوسرے ضروری کاموں کے بعد جو وقت بچتا تھا آپ اسے تصنیف و تالیف کے کام میں صرف فرماتے تھے۔ اس قدر مصروف زندگی میں آپ نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں حجۃ اللہ البالغہ جیسی بلند پایہ اور ضخیم کتاب[1] بھی ہے۔

وفات:

سنہ ۱۱۳۱ھ سے لے کر سنہ ۱۱۷۶ھ تک تقریباً ۴۵ سال نہایت مفید علمی اور مذہبی خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ سن پیدائش اور سن وفات کے حساب سے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۲ سال تھی۔

---

[1] قومی کتب خانہ لاہور نے دو حصوں میں اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بہت عمدہ طریقے سے چھاپی گئی ہے۔ ظاہری خوبصورتی کے علاوہ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ محترم مصنف کی طرح اس کے مترجم مولانا عبدالرحیم سرحدی مرحوم بھی بہت قابل اور درد دل رکھنے والے بزرگ تھے۔

ہے اور فرصت زندگی کا وقفہ بھی آپ کے ولی کامل اور محب اسلام ہونے کی شہادت دیتا ہے کیونکہ ہمارے ہادی اور مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اکثر جلیل القدر صحابہ نے ۶۰ اور ۶۳ سال کے درمیان ہی وفات پائی۔

اولاد:

حضرت نوح علیہ السلام کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے حد مخلص، قابل اور نیک لوگ صالح اولاد سے محروم رہتے ہیں لیکن اللہ پاک نے اس سلسلے میں آپ پر خاص فضل فرمایا۔ آپ نے چار صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے اور ان میں ہر ایک روشنی کا مینار ثابت ہوا۔ حضرت شاہ صاحب کے ان فرزندان سعید کے نام یہ ہیں:

(۱) حضرت شاہ رفیع الدین (۲) حضرت شاہ عبدالقادر۔
(۳) حضرت شاہ عبدالعزیز (۴) حضرت شاہ عبدالغنی۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ کو اللہ پاک نے یہ شرف بخشا۔ کہ آپ نے فارسی زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اردو زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے درس حدیث کے ذریعے بیش بہا خدمات انجام دیں اور شاہ عبدالغنیؒ کو اللہ پاک نے یہ عزت دی۔ کہ ان کے ہاں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسا نامور فرزند پیدا ہوا۔

اس مضمون میں حضرت شاہ صاحب کی زندگی کے مختصر حالات پیش کیے گئے ہیں لیکن ان کے مطالعے سے بھی بہت سی ایسی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ کہ اگر ہم ان پر غور کریں تو اپنی ذات کی اور اپنے ماحول کی بہت سی خرابیاں دور کر سکتے ہیں۔ خدا ہم سب کو اس کی توفیق دے۔ آمین ۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

قوموں کے لئے سب سے بڑی ذلّت اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ کسی اور قوم کے لوگ حکومت کے اختیارات سنبھال لیں۔ اِس حالت کو غلامی کی زندگی کہتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں بعض بے وقوف، اور بے غیرت لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ کسی اور قوم کے لوگوں کا حاکم بن جانا غلامی نہیں، دوسروں پر حکومت کرنے والے لوگ بھی زور شور سے یہی پروپاگنڈہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے غلامی کی زندگی تو دراصل وہ تھی جب کمزور لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر غلاموں کی منڈیوں میں لے جاتے تھے اور جانوروں کی طرح بیچ ڈالتے تھے۔

یہ لوگ اپنی بے غیرتی اور ظلم کو چھپانے کے لئے چاہے کچھ بھی

کہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی غیر قوم کا حاکم بن کر سارے اختیار اپنے قبضے میں کر لینا غلامی ہی ہے۔ زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے اس کی ظاہری صورت میں تھوڑا سا فرق ضرور آ گیا ہے کمزور لوگوں کو زنجیروں میں باندھ کر فروخت نہیں کیا جاتا۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے پرانے زمانے کی اُس خوفناک غلامی اور نئے زمانے کی اس غلامی میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ پرانے زمانے کے ظالم لوگ بھی کمزوروں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کر دیتے تھے اور ان کی صلاحیتوں سے خود فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس زمانے کی ایسی قومیں بھی یہی کرتی ہیں جب وہ کسی قوم کو محکوم بنا لیتی ہیں تو انہیں ہر بات میں اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب تک محفوظ نہیں رہتا۔

بدقسمتی سے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں پر کچھ عرصہ پہلے ایسا ہی برا وقت آ گیا تھا۔ کوئی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس برصغیر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مسلمانوں ہی کی حکومت تھی۔ یہ حکومت ان بزرگوں کی نیکیوں کی وجہ سے ملی تھی جو اللہ کا سچا دین اسلام پھیلانے کے لئے گھروں سے ... تھے اور جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دنیا سے برائی کا نام نشان مٹا دیں۔ مسلمانوں نے جب ان کے طریقوں کو چھوڑ دیا اور کافروں کی طرح عیش عشرت میں

پڑ گئے تو ان سے حکومت کے اختیار چھن گئے۔

مسلمانوں کی حکومت چھیننے کے لئے دو طرف سے حملہ ہوا۔ پہلا حملہ انگریز قوم نے کیا۔ یہ قوم اس برصغیر میں سوداگری کا سامان لیکر داخل ہوئی تھی اور مسلمان بادشاہوں نے اسے ہر طرح کی رعائتیں دی تھیں۔ جب انگریزوں نے دیکھا اس ملک کے حاکم اس کی حفاظت کی طرف سے غافل اور عیش و عشرت میں غرق ہیں تو انہوں نے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرا حملہ ہندوستان میں بسنے والی ان قوموں کی طرف سے ہوا جو اسلام کے سوا اور مذہبوں کی ماننے والی تھیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی حکومت میں یہ قومیں برابر کی حصہ دار تھیں۔ ان کے قابل لوگوں کو مسلمان بادشاہوں نے بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا تھا اور مذہب کے معاملے میں بھی انہیں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ مسلمان ان کی عبادت گاہوں کی نہ صرف حفاظت کرتے تھے بلکہ نئی عبادت گاہیں بنانے اور خاص خاص مذہبی مقامات کا انتظام ٹھیک رکھنے کے لیئے مالی امداد بھی دیتے تھے لیکن اس اچھے سلوک کے باوجود ان قوموں میں زیادہ لوگ ایسے تھے جو مسلمانوں سے خوش نہ تھے۔ ان کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی حکومتیں قائم کرنا چاہتے تھے۔ مذہبی تعصب کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی

تھی کہ مسلمان سچے مسلمان نہ رہے تھے۔

ہندوستان میں بسنے والی ان قوموں میں مرہٹوں اور سکھوں کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ مرہٹوں نے بمبئی اور سورت کے علاقے میں اور سکھوں نے پنجاب میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ چونکہ یہ حکومتیں یہ کہہ کر قائم کی گئی تھیں۔ کہ مسلمان ظالم ہیں اور زبردستی ہمارے ملک میں گھس آئے ہیں اس لیے مسلمانوں کے خلاف ان لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ نفرت اور غصہ تھا۔ اگر مسلمان ایسے ہی ہوتے تو یہ نفرت اور غصہ ٹھیک مانا جاتا لیکن یہ تو کھلا جھوٹ تھا، ان لوگوں نے صرف اپنی حکومتیں قائم کرنے کے لیے سیدھے سادے لوگوں کو بھڑکایا تھا۔

شروع میں آنے والے مسلمان غیر ملکوں کے رہنے والے ضرور تھے لیکن انہوں نے اس ملک کو اسی طرح اپنا اصلی وطن بنا لیا تھا۔ جس طرح اُن سے پہلے وسطِ ایشیا سے آنے والی آریہ قوم یہاں بس گئی تھی، اگر کسی غیر ملک سے آکر یہاں آباد ہونا ایسا ہی جرم تھا تو سب سے بڑے مجرم خود وہ لوگ تھے جو مسلمان کو غیر ملکی بتاتے تھے۔

اسی طرح مسلمانوں پر یہ الزام بھی بالکل غلط تھا۔ کہ وہ ظلم اور

بے انصافی کرنے والے ہیں۔ اگر مسلمان واقعی ایسے ہوتے تو اپنی حکومت کے سات آٹھ سو برسوں میں اِس ملک کے اندر غیر مذہب والوں کی ایک عبادت گاہ بھی نہ چھوڑتے اور تلوار گھما کر ان سب کو زبردستی مسلمان بنا لیتے۔ اس کے خلاف انہوں نے تو دوسرے مذہب والوں کی پوری پوری عزت کی تھی اور انہیں اپنی حکومت میں حصہ دار بنا لیا تھا۔

غیر مذہب والوں کی کچھ عبادت گاہوں کو ان کے ہاتھوں نقصان ضرور پہنچا تھا جیسے سومناتھ کا مندر، لیکن یہ سب کچھ لڑائی کے دنوں میں ہوا تھا، اور اس کی خاص وجہ بھی یہ ہوئی تھی۔ کہ لڑنے والے لوگوں نے اِن عبادت گاہوں کو جنگی قلعے بنا رکھا تھا۔ علاوہ ازیں لڑائی کے دنوں میں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی تازہ مثال ۱۹۴۷ء کے فسادات کے واقعات ہیں، جب پاکستان بنانے کے معاملے پر ہندو مسلمانوں میں جھگڑا چل رہا تھا تو بہت سی عبادت گاہوں پر بم پھینکے گئے اور عبادت کرنے والے لوگوں کو قتل کیا گیا۔ خاص طور سے مسجدوں پر تو ایسے حملے بہت زیادہ ہوئے۔ چنانچہ ان خوفناک فسادات کے تقریباً سولہ سترہ سال بعد ۱۹۶۳ء تک جب ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں

ایسی بہت سی عبادت گاہیں ویران پڑی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں لوگ گھروں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے زمانے کی ایک مثال لاہور کی مسجد شاہ چراغ ہے جو ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کو دی گئی۔ پہلے اسے دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں پر ظلم :

انصاف کی بات تو یہ تھی کہ جس طرح مسلمانوں نے اپنی حکومت کے دور میں غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا اور انہیں پوری مذہبی آزادی دی تھی، ہندوستان کی یہ نئی غیر مسلم حکومتیں ان کے ساتھ انصاف کرتیں اور ان کے حقوق کی حفاظت کی جاتی، لیکن ایسا نہ ہوا خاص طور سے پنجاب کے سکھوں نے اس سلسلے میں بہت زیادتی کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا، یہاں تک کہ مسجدوں میں اذان دینے پر بھی پابندی لگا دی۔

یہ زمانہ وہ تھا جب انگریزوں نے ہندوستان کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر ان کے سامنے بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ جن لوگوں میں غیرت نہیں ہوتی وہ تو ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور ہر قسم کی بے غیرتی کو گوارا کر لیتے

ہیں لیکن باہمت اور باغیرت لوگ اپنی بے عزتی کو گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور سے غلامی کی زندگی تو انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتی۔

ہندوستان میں مسلمان قوم پر یہ برا وقت آیا تو اس قوم کے غیرتمند لوگوں نے اپنی کھوئی ہوئی عزت اور آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں دو طرح کوششیں ہوئیں

۱۔ کچھ بزرگوں نے تحریر اور تقریر یعنی وعظ کہہ کر اور کتابیں لکھ کر ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو مذہب میں شامل ہو گئی تھیں اور جو دراصل اِس ساری مصیبت کا سبب تھیں۔ اِن بزرگوں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نام چاند اور سورج کی طرح چمکتے ہیں۔ اِس کتاب کے پچھلے ورقوں میں آپ ان دونوں بزرگوں کی زندگی کے حالات پڑھ چکے ہیں

۲۔ کچھ ہمت والے لوگوں نے جہاد کر کے یعنی تلوار کی طاقت سے ان برائیوں کو دُور کرنے کی کوشش فرمائی۔ بعض لوگ اس دوسری کوشش کو ایک طرح کی کمزوری اور تشدد خیال کرتے ہیں لیکن زندگی کے اسلامی فلسفے میں قلم اور زبان کی طرح تلوار استعمال کرنا بھی ضروری ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ برائی میں بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے بعض لوگوں کے دل ایسے سخت ہو جاتے ہیں اور برائی کرنے میں ان کی

جرأت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ زبانی کی گئی نصیحتوں کی بالکل پروا نہیں کرتے وہ صرف تلوار کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا زور توڑنا ضروری ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو دنیا فساد کا گھر بن جائے۔ چنانچہ اسی لئے اسلام نے ایسے لوگوں سے لڑنے کو ضروری بتایا ہے۔ اس کا نام جہاد رکھا ہے اور یہ مذہب کی رو سے ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس سلسلے میں صرف اس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہ مسلمان دنیا کا فائدہ حاصل کرنے اور اپنی حکومت کو بڑھانے کے لیے نہ لڑیں بلکہ ان کی تلوار صرف ظالموں اور بے انصافوں کے خلاف اُٹھے۔

ہندوستان میں اس دوسرے گروہ کے دو بزرگوں حضرت سید احمد بریلویؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل دہلویؒ کے نام سب سے اوپر لکھنے کے قابل ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں ایک سچی اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے انہی دونوں بزرگوں نے کوشش فرمائی اور اس اچھے مقصد کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ہم آپ کو حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے حالات سناتے ہیں:

زندگی کے حالات:

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالغنی کے صاحبزادے تھے۔ آپ ابھی نو عمر ہی تھے۔ کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے آپ کی تربیت اور تعلیم حضرت شاہ عبدالقادر کے سائے میں ہوئی جو آپ کے حقیقی چچا تھے۔ شاہ عبدالقادرؒ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔

شاہ اسمٰعیلؒ کو اللہ پاک نے بہت اچھا ذہن عطا کیا تھا۔ استاد کی زبان سے جو بات ایک بار سن لیتے تھے۔ پوری طرح یاد ہو جاتی تھی۔ اس لئے آپ تعلیم کی طرف کم توجہ دیتے تھے۔ تھوڑی دیر جماعت میں بیٹھے اور موقع پاکر کھیلنے کے لئے نکل گئے۔ ایک بار استاد صاحب نے اس بات پر ٹوکا تو آپ نے فرمایا۔ آپ نے اب تک جو کچھ پڑھایا ہے۔ مجھے حرف بحرف یاد ہے۔ اس پر استاد صاحب نے امتحان لینے کے لئے آپ سے ایک سبق سنا، آپ نے فر فر سنا دیا اور یہ قابلیت دیکھ کر انہیں اطمینان ہو گیا۔

اس قابلیت کی وجہ سے آپ نے بہت جلد فضیلت کی سند حاصل کر لی اور درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اللہ پاک نے آپ کو ایسی مہارت اور قابلیت دی تھی کہ جس مسئلے کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا فوراً اس کا جواب دے دیتے تھے اور آپ کا جواب ایسا ہوتا تھا کہ

بڑے بڑے عالم حیران رہ جاتے تھے۔ ایسی قابلیت دیکھ کر بعض لوگوں کو شک ہوتا تھا کہ شاید کوئی اور شخص آپ کو ان باتوں کے بارے میں سکھا دیتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات راستہ چلتے ہوئے آپ کو روک کر کوئی مشکل سوال پوچھا جاتا اور آپ نہایت آسانی سے اس کا جواب دے دیتے۔

جیسا کہ ہم نے بتایا آپ کا خاندان ایک بہت بڑا مذہبی اور علمی خاندان تھا۔ آپ کے بزرگ مدت سے دین کی خدمت کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے بھی اسی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنایا۔ اس زمانے میں سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مذہب میں جو کھوٹ شامل ہو گیا ہے اُسے نکال کر اسے کھرے سونے کی طرح کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ نے ان رسموں کو مٹانے کے لئے خاص طور سے کام کیا جو مسلمانوں نے دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی اختیار کر لی تھیں۔ اور انہیں مذہب کا درجہ دے دیا تھا۔

اعلیٰ درجے کی قابلیت کے ساتھ شاہ صاحب کی جسمانی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ آپ کو فوجی کرتب سیکھنے اور ورزش کا خاص شوق تھا۔ تیرنے کی اس قدر مشق کی تھی۔ کہ چڑھے دریا میں نہایت آسانی سے میلوں تیر سکتے تھے۔ اپنے اندر برداشت کی قوت پیدا کرنے کے لئے آپ دلّی

کی شاہی مسجد کے سنگین فرش پر دوپہر کے وقت گھنٹوں ننگے پیر ٹہلا
کرتے تھے یوں آپ کی ذات میں وہ ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں
جو ایک سچے مسلمان میں لازمی طور پر ہونی چاہئیں یعنی آپ روحانی طور
پر بھی پوری طرح صحت ور تھے اور جسمانی طور پر بھی۔

حضرت سید احمد بریلوی سے ملاقات:

جس زمانے میں حضرت اسمٰعیل شہید دلی میں اسلام کی تبلیغ اور
مسلمانوں کی اصلاح کا کام کر رہے تھے بریلی کے ایک سید خاندان
کے ایک عالم حضرت سید احمدؒ ہندوستان کے مسلمانوں کو جہاد کے لئے
تیار کر رہے تھے۔ حضرت سید احمدؒ نے حضرت شاہ اسمٰعیلؒ کے خاندان
کے ایک بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز سے تعلیم حاصل کی تھی اور تعلیم کی
تکمیل کے بعد ایک مسلمان رئیس کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے جس زمانے
میں آپ فوجی خدمات انجام دے رہے تھے آپ کو پنجاب کے مسلمانوں
کی زبوں حالی کا علم ہوا، کابل سے آنے والے ایک سوداگر نے آپ کو
یہ واقعہ سنایا، کہ جب ہم سفر کر رہے تھے ایک جگہ ہم نے چند عورتوں
کو کنوئیں پر پانی بھرتے ہوئے دیکھا۔ ہم پیاسے تھے اس لئے ان کے
پاس گئے اور اشارے سے کہا کہ ہمیں پانی پلاؤ۔ ہمارا خیال تھا پنجاب

کی رہنے والی یہ عورتیں ہماری زبان نہ سمجھ سکیں گی۔ لیکن ایک عورت نے بتایا کہ ہم کابل ہی کی رہنے والی ہیں۔ سکھ ہمیں زبردستی اٹھا لائے ہیں۔ اور اب ہم اس بری حالت میں زندگی گذار رہی ہیں۔

یہ حالات سن کر حضرت سید احمد بریلویؒ نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو گا ان مظلوموں کو نجات دلائیں گے۔ ملازمت کا سلسلہ ترک کر کے آپ نے بستی بستی پھر کر لوگوں کو جہاد کرنے کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ اور ضروری سامان اکٹھا کرنے لگے۔ اس سلسلے میں آپ دلی بھی تشریف لائے۔ یہاں حضرت شاہ اسمٰعیلؒ سے ملاقات ہوئی اور شاہ صاحب نے بھی اس اچھے کام میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۸۲۰ء کی بات ہے۔

حج کا سفر

حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ کے مرید بننے کے ایک سال بعد ۱۸۲۱ء میں آپ نے حج کا فرض ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور لوگوں کا اس کا علم ہوا تو بہت سے عقیدت مند ساتھ چلنے کے لیئے تیار ہو گئے اور اللہ کے خاص بندوں کا یہ قافلہ خیر و خوبی کے ساتھ اس مبارک سفر پر روانہ ہو گیا۔ شاہ صاحب نے حج کا فرض ادا کرنے کے علاوہ عرب کے بڑے بڑے عالموں سے ملاقاتیں کیں اور عراق اور شام وغیرہ ملکوں میں

جا کر وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا۔ آپ تین سال بعد وطن لوٹے۔

جہاد کی تیاری :

حج کا فرض ادا کرنے کے بعد آپ یکسو ہو کر جہاد کی تیاری میں لگ گئے۔ یہ کام جس قدر دشوار تھا ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ حکومت کی مخالفت کے علاوہ آپ کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ یہ آئی۔ کہ اس زمانے کے بعض عالموں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو مذہبی باتوں میں بعض اختلافات کی وجہ سے شاہ صاحب کی مخالفت کرتے تھے، ان کی مخالفت نیک نیتی کی بنا پر تھی لیکن زیادہ ایسے تھے جو اپنے ذاتی فائدوں کو خطرے میں دیکھ کر ان کے دشمن بن گئے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے بگڑے ہوئے عقیدوں کی وجہ سے انہیں خوب لوٹتے تھے۔ شاہ صاحب نے اسلام کی صحیح باتیں پیش کر کے نام کے مسلمانوں کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کی تو ایسے لوگوں کو اپنا حلوہ مانڈہ خطرے میں نظر آیا اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کو آپ کے خلاف بھڑکایا۔ کہ نعوذ باللہ آپ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ویسا ادب نہیں کرتے جیسا ادب ایک سچے مسلمان کو کرنا چاہیئے۔ حالانکہ سچی بات

یہ تھی۔ کہ آپ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین اسلام ہی کی عزت بڑھانے کے لیئے کوشش کر رہے تھے، آپ کی آرزو یہ تھی۔ کہ دوسری قوموں نے مسلمانوں پر جو غلبہ پالیا ہے وہ ختم ہو جائے اور یہ قوم پہلے کی طرح آزاد اور عزت والی بن جائے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے اور ہمارا خیال ہے اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ کہ اصل میں یہ فتنہ انگریز سیاست والوں نے کھڑا کیا تھا۔ اگرچہ شاہ صاحب نے ابھی تک خاص ان کی حکومت کے خلاف کچھ بھی نہ کہا تھا لیکن وہ اندازہ کر رہے تھے کہ اگر مسلمان قوم اپنے ان مخلص رہنماؤں کے بتائے ہوئے راستے پر چل نکلی اور اپنی برائیاں دور کر کے طاقتور ہو گئی تو بالآخر اس ملک سے ہماری سلطنت کا بھی جنازہ نکل جائے گا۔ چنانچہ ان سیاستدانوں نے اپنے مطلب کے کچھ آدمیوں کے ذریعے اسلام اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان سچے شیدائیوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

کسی نے کہا ہے چاند کی طرف خاک اڑانے سے اس کا رنگ میلا نہیں ہوتا، ان مخالفوں کی مخالفت بھی بے نتیجہ رہی، جن مسلمانوں کے دل میں اسلام کی سچی محبت تھی۔ وہ شاہ صاحب کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور جہاد کی تیاری کرنے لگے۔

سچائی کا اثر:

اللہ پاک نے حضرت شاہ صاحب کی زبان میں ایسا اثر دیا تھا کہ جو شخص پوری توجہ سے ایک بار آپ کی باتیں سن لیتا تھا وہ اپنی برائیاں چھوڑ کر پکا سچا مسلمان بن جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ خود سچے مسلمان تھے اور لوگوں سے صرف انہی باتوں پر عمل کرنے کو کہتے تھے، جن پر خود عمل کرتے تھے۔ یہ بات ہم نے اس لئے خاص طور سے لکھی ہے، کہ اگر ہم بھی اس طریقے کو اپنا لیں، یعنی خود پکے سچے مسلمان بن جائیں اور پھر دوسروں کو اچھائی کی طرف بلائیں تو اللہ پاک ہماری باتوں میں بھی ویسا ہی اثر دے دے گا۔

اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ واقعے بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ شاہ صاحب، دلی کی ایک مشہور طوائف کے کوٹھے پر تشریف لے گئے اور اسے برائی کی زندگی چھوڑ کر نیکی کی زندگی اختیار کرنے کی نصیحت کی۔

طوائف اُن عورتوں کو کہا جاتا ہے جو انسانی برادری کے عام دستور کے مطابق کسی ایک مرد سے شادی کر کے گھر نہیں بساتیں بلکہ کھلم کھلا گناہ اور بے حیائی کی زندگی اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی عورتوں

کے ٹھکانوں پر گناہ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے اور وہاں نیکی اور سچائی کی بات پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے لیکن جب اس طوائف نے حضرت شاہ صاحب کی باتیں سنیں تو اس نے اپنی اس گناہ کی زندگی سے فوراً توبہ کرلی۔

اس واقعے سے ہمیں ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ پاک نے ایمان کا نور دیا ہے وہ گناہ کی زندگی میں پھنسے ہوئے لوگوں سے نفرت نہیں کرتے۔ نہ ان کے برے برے نام رکھ کر انہیں ذلیل کرتے ہیں بلکہ سچے ہمدرد بن کر ان کے پاس جاتے ہیں اور پیار محبت سے انہیں سمجھاتے ہیں۔ بالکل یوں جیسے کوئی حکیم یا ڈاکٹر کسی مریض کا علاج کرتا ہے۔

جہاد شروع ہو گیا:

۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۵ء تک نہایت صبر محنت اور استقلال سے جہاد کی تیاری کرنے کے بعد جب ان دونوں رہنماؤں (حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل) نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اب ہمارے پاس کافی سامان اکٹھا ہو گیا ہے اور کافی تعداد میں ایسے لوگ جمع ہو گئے ہیں جو خوشی خوشی اللہ کے راستے میں جان دے

دی گئے تو انہوں نے جہاد کا اعلان کر دیا۔

سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ان بزرگوں نے میدانِ جہاد کا نقشہ یہ بنایا، کہ دلی سے چل کر اس علاقے میں پہنچ جائیں جو افغانستان سے ملا ہوا ہے، وہاں جا کر افغانستان کے بادشاہ اور سرداروں سے امداد حاصل کریں جو اگرچہ پنجاب کی سکھ حکومت کے اثر میں تھے لیکن اپنے علاقوں پر پورا پورا قبضہ رکھتے تھے۔

جو لوگ اس زمانے کے ہندوستان کے تمام حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا زور توڑنے کے لئے لڑائی کا یہ ایسا نقشہ تھا کہ کوئی قابل سے قابل فوجی جرنیل بھی اس سے بہتر نقشہ نہ بنا سکتا تھا اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو معمولی سے عرصے میں پنجاب فتح ہو جاتا اور اس کے بعد نہایت آسانی سے پورے ہندوستان کو آزادی نصیب ہو جاتی لیکن افسوس اِن قابل اور مخلص رہنماؤں کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی ہمارے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ مقدس رہنما مسلمان قوم کو جو عزت دینا چاہتے تھے ابھی وہ اس کی حقدار نہ بنی تھی۔ اللہ پاک کی مشیت یہ تھی۔ کہ اسے سو سوا سو سال غیر قوم کی غلامی کا مزہ چکھایا جائے اور جب اُسے غلامی اور آزادی کا فرق

معلوم ہو جائے تب آزادی دی جائے۔

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اللہ پاک کا قانون یہی ہے کہ زمین کا وارث صرف انہی لوگوں کو بنایا جاتا ہے جو نیک اور بہادر ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں یہ امنگ ہوتی ہے۔ کہ حکومت کی طاقت حاصل کر کے ہم اس دنیا کو پہلے سے زیادہ خوبصورت بنا دیں گے اور اللہ کے بندوں کی تکلیفیں دور کریں گے۔

ہماری اس بات کے خلاف کبھی کبھی ظالم اور عیش عشرت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی حکومت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی مثال ان ڈاکوؤں کی سی ہوتی ہے جو کسی بستی کے لوگوں کی غفلت اور بزدلی کے باعث کچھ دیر کے لئے سیاہ سفید کے مالک بن جاتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں لوٹتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں قتل کرتے ہیں لیکن ان کا یہ اقتدار معمولی عرصے کے لئے ہوتا ہے:

مجاہدوں کی ابتدائی کامیابی:

جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ہندوستان کے یہ مجاہد جو اس ملک کو ظالموں اور فاسق و فاجر یعنی برائی کے راستے پر چلنے والے اور برائی پھیلانے والے لوگوں کے پنجے سے نجات دلانے اور اللہ کے سچے

دین اسلام کی حکومت قائم کرنے کے لئے گھروں سے نکلے تھے۔ دلی سے چل کر اس علاقے میں پہنچ گئے جو افغانستان کی سرحد سے ملا ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر بڑا ہی مشکل تھا۔ اس زمانے میں نہ ریل گاڑی تھی نہ موٹریں اور نہ ایسی سڑکیں بنی ہوئی تھیں جیسی ہم آج کل دیکھتے ہیں۔ پہاڑوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے اونچے نیچے میدانوں میں کئی سو میل کا مشکل سفر کرنا پڑا۔ طرح طرح کی مصیبتیں پیش آئیں لیکن اللہ پاک کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے تمام مصیبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔

اُس زمانے میں اِس علاقے پر بہت سے سردار حکومت کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ ایسے تھے جو عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا۔ کہ جس طرح بھی ہو سکتا ہو اپنی ریاستوں اور جاگیروں کو باقی رکھیں لیکن جب حضرت سید احمدؒ بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ نے انہیں ان کا بھولا ہوا فرض یاد دلایا اور مسلمانوں کو غلامی کے عذاب سے بچانے کے لئے جہاد میں حصہ لینے کو کہا تو کئی ایک سردار ان بزرگوں کے ہم خیال بن گئے اور اس طرح مجاہدوں کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ ایک روایت کے مطابق مجاہدوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔

سکھوں کے لشکر سے مجاہدوں کا سب سے پہلا مقابلہ ہشت نگر کے مقام پر ہوا، اس مقابلے میں سکھوں کو شکست ہوئی، اس فتح سے مجاہدوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ بہت جلد پورا پنجاب فتح ہو جائے گا۔

اس فتح کے بعد اکوڑہ کے مقام پر سکھ فوج سے دوسرا مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں بھی رنجیت سنگھ کی فوج ہار گئی۔ اب مجاہدین نے باقاعدہ اپنی حکومت قائم کر لی اور جو علاقہ ان کے قبضے میں آچکا تھا اس کا انتظام بالکل اس طرح کیا جیسے اسلام نے حکم دیا ہے، سرداروں کے بنائے ہوئے غلط سلط قانون توڑ کر اسلامی قانون جاری کر دیا گیا۔

چھپا وار!

ان دو مقابلوں میں دشمن کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جنگ کے میدان میں ان مجاہدوں کو شکست دینا آسان نہیں اس لئے انہوں نے چالاکی اور جوڑ توڑ کے ذریعے انہیں ہرانے کی کوشش کی، اس سلسلے میں ایک خطرناک وار یہ کیا گیا کہ حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے

والا اور اسلام کے اصل عقیدوں سے پھرا ہوا مشہور کر دیا گیا۔ دشمنوں کے جاسوسوں نے سیدھے سادے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ جن لوگوں کو تم نے اپنا سردار بنا لیا ہے وہ تو وہابی ہیں اور وہابی کی تعریف انہوں نے وہی کی جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ یعنی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور توہین کرنے والے۔

یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات تھی۔ جس زمانے میں یہ دونوں بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے اسی زمانے میں اللہ کے ایک بندے محمد بن عبدالوہاب نے عرب کے مسلمانوں کی اصلاح کی تحریک شروع کی تھی۔ دراصل ان بزرگوں نے اپنی خداداد قابلیت سے یہ بات جان لی تھی۔ کہ مسلمان قوم کے ذلیل اور بے اقتدار ہو جانے کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ اسلام کے اصلی اصولوں کو چھوڑ کر من گھڑت رسموں اور رواجوں میں الجھ گئی ہے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان پھر قرآن اور حدیث کی طرف لوٹ آئیں۔ یہ تحریک مسلمان قوم کے لئے تو ہر طرح فائدہ مند تھی لیکن اس قوم کے دشمن اس کی کامیابی کی صورت میں اپنی موت دیکھ رہے تھے اس لئے انہوں نے یہ چالاکی کی تھی۔ کہ سادہ دل مسلمان اپنے ان سچے ہمدردوں کو اپنا دشمن سمجھنے

لگیں۔

محمد بن عبدالوہاب کے ساتھیوں اور دوسرے مخلص مسلمانوں کو وہابی مشہور کر کے عام مسلمانوں کو ان کے خلاف بھڑکانے کی سازش بعض انگریز سیاستدانوں نے کی تھی۔ حضرت شاہ اسمٰعیلؒ اور حضرت سید احمدؒ کو وہابی مشہور کرنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ تحقیق کرنے والے عالموں نے ان دونوں بزرگوں کے حالات میں یہ بات لکھی ہے۔ کہ جن دنوں بالاکوٹ کے میدان میں سکھوں سے آخری لڑائی ہوئی ایک انگریز فوجی سردار الیگزینڈر گارڈنر اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت وہاں آیا تھا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انگریزی حکومت اس معاملے میں بالکل ہی بے تعلق نہ تھی بلکہ خفیہ طور پر حصہ لے رہی تھی۔ یقین ہے ان بزرگوں کو وہابی مشہور کرنے والے اور سرحد کے مسلمان سرداروں کو ان کے خلاف بھڑکانے والے انگریزوں کے جاسوس ہی تھے۔

یہ سازش کیوں کامیاب ہو گئی!

کسی عقلمند نے کہا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے وہیں پانی مرتا ہے اس کہاوت کا مطلب یہ ہے جن لوگوں میں پہلے سے خرابی ہوتی ہے

وہی اپنے دشمنوں کے ہاتھ پیر مضبوط کرتے ہیں۔ دور دراز سے چل کر آنے والے مجاہدوں کی طرح اگر اس علاقے کے ہزاروں کے دلوں میں بھی اپنے مذہب کی سچی محبت ہوتی اور وہ بھی اپنی قوم کو معزز دیکھنے کے لئے بے چین ہوتے تو دشمنوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کا ان پر بالکل اثر نہ ہوتا لیکن یہاں تو ادھ گھٹنے کو پھیلنے کا بہانہ والی بات تھی۔ یہ لوگ مارے باندھے مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، ان کے دلوں میں اسلام کی ترقی کی سچی لگن نہ تھی اس لئے فوراً اپنے دشمنوں کی باتوں میں آ گئے۔ یہ ناسمجھ لوگ اپنے ذاتی فائدوں اور آرام کو قوم کی آزادی اور عزت سے زیادہ جانتے تھے۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات جانتا تھا کہ ایک طرف انگریزوں نے ہندوستان کی کئی مسلمان حکومتوں کے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ اور دوسری طرف سکھوں کے لشکر کابل تک دہشت پھیلا رہے ہیں اور لوٹ مار میں مصروف ہیں لیکن ان کے نزدیک سب اچھا تھا۔

آخری معرکہ :

سید صاحب اور شاہ صاحبؒ کو ان حالات کا پورا پورا اندازہ تھا اس لئے انہوں نے یہ کوشش کی۔ کہ کسی ایسی جگہ سکھ فوج کا مقابلہ

کیا جائے جو ہر لحاظ سے محفوظ ہو. سارے علاقے کے نشیب و فراز کا اندازہ لگانے کے بعد فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اس علاقے کو منتخب کیا گیا جسے بالاکوٹ کہا جاتا ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ ایک طرف دریائے کنہار تھا اور دوسری طرف اونچے پہاڑ، مجاہدین کی پشت پناہی کر رہے تھے۔

جس فوج کے پہلو اور پشت محفوظ ہو اس کے ہارنے کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے ایک غدار مسلمان نے ان سارے فائدوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔ اس ظالم نے سکھ فوج کے کمانڈر شیر سنگھ کو ایک خفیہ راستہ بتا دیا جو پہاڑوں کے درمیان سے بالاکوٹ تک آتا تھا۔ اور اس راستے سے سکھ فوج چپکے سے مجاہدوں کے سر پر پہنچ گئی ۔

شہادت کا تاج :

اللہ کے سچے دین کی عظمت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے یہ مجاہد کھلے میدان میں سکھ فوج سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور انہیں پورا یقین تھا۔ کہ اس لڑائی میں بھی انہی کی جیت ہو گی۔ سکھ سپاہی اچانک ہی پہاڑ پر نمودار ہوئے تو وہ حیران

رہ گئے۔ کوئی اور لشکر ہوتا تو یہ صورتِ حال دیکھ کر شاید بھاگ کھڑا ہوتا لیکن مجاہدین ذرا خوف زدہ نہ ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے جنگی نقشے میں تبدیلی کی اور سکھوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔

یہ لڑائی اب ایسی نہ تھی جس میں مجاہد اپنے فتحیاب ہونے کی توقع کر سکتے۔ خفیہ پہاڑی راستہ معلوم ہو جانے کی وجہ سے سکھوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ مجاہدین پر دو طرف سے پل پڑے تھے اور ان کے اس زور دار حملے نے مجاہدین کی طاقت اور تنظیم کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے کی بجائے وہ الگ الگ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اس طرح ان کے ہتھیار بالکل بے اثر ہو گئے تھے۔

اس صورتِ حال کے علاوہ ایک بڑی مصیبت یہ آئی کہ بہت سے مقامی باشندے اس نازک وقت میں مجاہدین کا ساتھ چھوڑ گئے۔ حضرت شاہ صاحب اور سید صاحب صاف دیکھ رہے تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ اب ہمارے حق میں نہ نکلے گا۔ وہ چاہتے تو اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ سکھ فوج کا سردار بھی انہیں امان دے سکتا تھا اور میدانِ جنگ سے فرار ہونے کا راستہ بھی ابھی کھلا ہوا تھا لیکن ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ دونوں بہادری سے لڑتے ہوئے شہید

ہو گئے۔ ان دونوں بزرگ شہیدوں کے مزار بالاکوٹ میں ہیں ؏

اس جدوجہد کا نتیجہ :

ایک آدمی تو یہی کہے گا کہ ان دونوں بزرگوں نے جو کوشش کی وہ ناکام ہو گئی۔ مسلمان قوم کو فائدے کی جگہ نقصان ہوا لیکن یہ بات ٹھیک نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری آج کی آزادی، خوش حالی اور عزت انہی بزرگوں کی کوششوں کا پھل ہے، بالاکوٹ کے میدان میں بے شک، انہیں شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی جانیں قربان کرنی پڑیں، لیکن اس قربانی نے مسلمانوں کے دلوں میں قربانی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس جنگ سے پہلے یہ پوری قوم غلامی اور بے غیرتی کی زندگی پر رضامند ہو گئی تھی، ہر شخص نے سمجھ لیا تھا۔ انگریزوں کا غلبہ اور دوسری قوموں کی حکومتیں اللہ پاک کی مشیت کے مطابق قائم ہوئی ہیں۔ ہماری تقدیر ہی میں غلامی اور ذلت لکھ دی گئی ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی کوشش سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ذلت تقدیر کا فیصلہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی آرام پسندی اور مذہب کے سچے اصولوں کو چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے۔ جس وقت بھی یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی مسلمانوں کو پھر ان کی کھوئی ہوئی عزت اور حکومت مل جائے گی۔

ان عزت والے بزرگوں کی وجہ سے یہ بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ کہ پستی کی طرف جاتی ہوئی مسلمان قوم میں سچے مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں نے دن رات محنت کر کے دین کی باتوں میں سے کھوٹ کو الگ کیا۔ غیر مسلموں کی طرف سے اسلام پر جو حملے کئے جاتے تھے انہیں روکا اور کھوئی ہوئی عزت اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ موجودہ زمانے میں ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ انہی کی قربانیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے!

مولٰینا محمد قاسم نانوتوی

بھارت کے صوبہ یو۔پی میں ایک مقام ہے دیوبند۔ یہاں ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی قائم ہے جس کا نام دارالعلوم دیوبند ہے یہ اسلامی یونیورسٹی اب سے پورے ایک سو سال پہلے سنہ ۱۲۸۳ھ میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے قائم کرنے والے ایک بہت بڑے عالم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ مولانا قاسم عالم فاضل ہونے کے علاوہ بہت بہادر، بے حد متقی اور ذی شعور تھے، ان خوبیوں کے علاوہ ان کی سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ ان کے دل میں اپنے مقدس مذہب اسلام کی حفاظت اور اسے پھیلانے کا جذبہ تھا۔ ہم آپ کو ان عزت والے بزرگ کی زندگی کے حالات سناتے ہیں۔

خاندان:

حضرت مولانا کا سلسلۂ نسب آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے خلیفہ صدیقِ اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے بارے میں یہ بات معلوم نہیں ہوسکی کہ وہ عرب سے چل کر کب ہندوستان آیا اور اس کے افراد نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا کے ایک دادا مولینا محمد ہاشم مشہور مغل شہنشاہ شاہجہان کے دربار سے وابستہ تھے اور ان کی خدمات کے بدلے بادشاہ نے بہت بڑی جاگیر عطا کی تھی۔

زمانے کے انقلابات اور بہت بڑا خاندان ہونے کی وجہ سے یہ جاگیر تقسیم ہوتی رہی اور اس خاندان کے افراد مالی طور پر معمولی حیثیت کے رہ گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا کے والد صاحب شیخ اسد علی خود اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا دھندا کرتے تھے اور ان کی سکونت قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں تھی۔

شیخ اسد علی کی مالی حالت بے شک معمولی تھی، لیکن خاندانی عزت برقرار تھی اور اسی وجہ سے ان کی شادی سہارنپور کے ایک معزز خاندان

میں ہوئی ۔

بچپن

مولینا قاسم رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۴۸ھ میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے خاندان میں دینداری بھی تھی اور علم کا چرچہ بھی تھا اس لئے ان کا بچپن عام دیہاتی بچوں سے خاصا مختلف تھا مسلمان شرفا کے دستور کے مطابق پانچ چھ سال کی عمر میں تعلیم شروع کر دی گئی اور انہوں نے نہایت قلیل عرصے میں قرآن حکیم ختم کر لیا۔

عام عادتوں کے لحاظ سے بھی مولینا دوسرے بچوں سے مختلف تھے۔ ان کی ہر بات سے نیکی اور شرافت ظاہر ہوتی تھی اور ان اچھی عادتوں کی وجہ سے ان کے بزرگوں کو اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ یہ بچہ بڑا ہو کر خاندان کا نام روشن کرے گا۔

بچپن کے زمانے میں انہوں نے ایک رات نہایت مبارک خواب دیکھا۔ مولینا نے دیکھا میں اللہ پاک کی گود میں بیٹھا ہوں۔ انہوں نے یہ خواب بیان کیا تو خواب کا علم جاننے والے ایک بزرگ نے یہ تعبیر بتائی۔ کہ یہ بچہ بڑا ہو کر بہت بڑا عالم بنے گا اور اسلام کی اشاعت میں شاندار خدمات انجام دے گا۔ گھر کے سب افراد کو اس بات سے

خوشی ہوئی اور سب ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگے۔

قرآن شریف ختم کرنے کے بعد مولینا کو ان کے ایک رشتے دار مولوی مہتاب علی کے پاس دیوبند بھیج دیا گیا۔ یہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے بڑا مدرسہ دلی میں داخل ہوئے۔ یہاں ان دنوں مولوی مملوک علی صدر مدرس تھے۔ انہوں نے مولینا کی ذہانت، محنت اور اچھی عادتوں کی وجہ سے ان کی طرف خاص توجہ دی۔

مولینا کو اللہ پاک نے کیسا اچھا ذہن دیا تھا اور وہ کیسی محنت سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اقلیدس انہوں نے کسی استاد کے بغیر پڑھ لی۔ مدرسے میں پڑھنے والے دوسرے طلبا کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں یقین نہ آیا چنانچہ مولینا کا امتحان لیا گیا اور یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ انہوں نے ہر سوال کا بالکل ٹھیک جواب دیا۔

فقہ، حدیث، فلسفہ اور ادب وغیرہ کے علاوہ مولانا نے مناظرے کے علم میں بھی کمال حاصل کیا۔ مذہبی معاملات پر وہ ایسے اچھے انداز

سے بحث کرتے تھے۔ کہ مخالف لاجواب ہو جاتے تھے۔ انہوں نے عیسائی پادریوں اور آریہ پنڈتوں سے بہت سے مناظرے کئے اور فتح پائی۔

ذاتی خوبیوں کے ساتھ اللہ پاک نے ان پر ایک خاص مہربانی فرمائی تھی کہ مدرسے میں ساتھی بھی اچھے ملے اور استاد بھی جن استادوں سے انہوں نے علم حاصل کیا ان میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے مولانا شاہ عبدالغنی اور مفتی صدرالدین جیسے عالم شامل ہیں۔ اسی طرح ان کے ہم مکتبوں میں حضرت رشید احمد گنگوہی شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد شمس العلماء، مولوی ذکاء اللہ جیسے لوگ شامل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سرسید بھی ان کے ہم مکتب تھے۔

مرشدِ کامل:

ظاہری تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روحانی تعلیم کی تکمیل کے لئے حضرت مولانا نے اس وقت کے مشہور بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی۔ حاجی صاحب سے مولانا کے خاندان کے تعلقات پہلے سے تھے اس لئے انہوں نے اور بھی توجہ فرمائی اور مرشد کی اس توجہ سے وہ تھوڑے سے عرصے میں کامل ہو گئے

روحانی علوم میں کامل ہونے کا یہ اثر ہوا۔ کہ مولینا کے دل سے دنیاوی شان وشوکت کا خیال اور مال ودولت کا لالچ بالکل نکل گیا۔ پرانے زمانے کے بزرگوں کے نمونے پر انہوں نے بالکل سادہ زندگی اختیار کر لی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل سادہ خوراک کھاتے تھے اور موٹا جھوٹا لباس پہنتے تھے۔ خدا کے فضل وکرم سے اُن کے سینے میں اتنا علم تھا۔ کہ اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے کوئی اعلیٰ سرکاری نوکری مل جاتی، ان سے کم پڑھے ہوئے ان کے کئی ساتھی اونچے درجے کے افسر بن گئے تھے اور خوب عیش آرام کی زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن مولینا نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا۔ مطبع احمدی نامی ایک چھاپہ خانے میں تصیح کا کام کیا۔ ہر ملازمت آپ کو یوں پسند تھی۔ کہ فالتو وقت میں طلباء کو قرآن شریف اور حدیث پڑھا سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ:

مولینا نہایت خاموشی سے دینی خدمات میں مصروف تھے۔ کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا جسے تاریخ میں ۵۷ء کا غدر کہا جاتا ہے۔ بات اصل میں یہ تھی۔ کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ ہی دل

کی نااہلی اور مسلمان امیروں کی نالائقی کی وجہ سے حکومت کے بڑے محکموں میں سخت گڑبڑ پھیل گئی تھی اور اس کمزوری کی وجہ سے سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریز قوم کو یہ موقع مل گیا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ اس پورے ملک پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ انہوں نے مدراس اور بنگال وغیرہ پر پوری طرح قبضہ کرنے کے بعد خاص دلی کی حکومت میں بھی عمل دخل حاصل کرلیا تھا اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حالت انگریزوں کے ایک ماتحت کی سی رہ گئی تھی۔ اس بات سے فوج کے افسروں کو بہت زیادہ رنج پہنچا تھا۔ وہ اپنے ملک کو غیروں کی غلامی میں دینے کے لئے تیار نہ تھے، غلامی کے خطرے کے علاوہ ان افسروں کے بگڑنے کی دوسری بڑی وجہ عیسائی پادریوں کی سرگرمیاں تھیں فرنگی گوروں کی سنگینوں کے سائے میں یہ لوگ نہایت اطمینان سے گاؤں گاؤں گھومتے اور لوگوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔

ان ملی جلی ناراضگیوں کی وجہ سے فوج کے ہندو مسلمان افسروں نے مئی کے مہینے میں انگریزوں کا حکم ماننے سے انکار کردیا اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا حاکم مان کر ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش کردی، اس سلسلے میں ان لوگوں سے یہ غلطی ہوئی

کہ وہ اپنے ساتھیوں کو پوری طرح قابو میں نہ رکھ سکے اور نہ بستیوں میں پھیلے ہوئے برے چال چلن کے لوگوں کی نگرانی کر سکے۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر طرف قتل و غارتگری شروع ہو گئی۔ اس افراتفری کا اثر مولانا کے علاقے تک بھی پہنچا اور یہ حالت ہو گئی کہ لوگوں کا اپنے گھروں سے نکلنا اور اپنا کاروبار انجام دینا دشوار ہو گیا۔

مولینا کی بہادری:

ایسے نازک وقت میں مولانا نے اپنے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کے حکم کے مطابق نہایت بہادری سے اپنے علاقے میں امن امان قائم کیا۔ اس جدو جہد میں کئی بار لٹیروں سے مقابلہ ہوا لیکن اللہ پاک کی مہربانی سے آپ کا گروہ ہمیشہ بالادست رہا۔

تقریباً سارے ملک میں گڑبڑ پھیل جانے اور غیر منظم ہونے کی وجہ سے بغاوت کرنے والی فوجیں صرف چند مہینوں میں مغلوب ہو گئیں انگریزوں نے دلی کے لال قلعے پر قبضہ کر کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ اور یوں اس ملک پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا۔ کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے سلسلے میں مولینا اور

آپ کے ساتھیوں کو انعام دیا جاتا اور اس اچھے کام کی تعریف کی جاتی لیکن انگریز حاکم اُلٹے آپ کے دشمن ہو گئے۔ مولینا کے دشمنوں کے بہکانے میں آکر انھوں نے یہ یقین کر لیا۔ کہ ان کا تعلق بغاوت کرنے والوں سے ہے اور اس یقین کی بنا پر گرفتاری کے وارنٹ نکال دئے۔ اس زمانے میں گرفتاری کے وارنٹ نکال دئے جانے اور گرفتار ہونے کا مطلب تھا پھانسی پانا۔ کیونکہ یونہی سرسری پوچھ کچھ کے بعد ایسے ملزموں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔

مولینا صاحب کو اپنے وارنٹ نکل جانے کا حال معلوم ہوا تو آپ روپوش ہو گئے۔ لیکن کہیں منہ چھپا کر نہیں بیٹھے بلکہ ضلع انبالہ کی طرف نکل گئے۔ اور وہاں اطمینان سے گھومتے پھرے۔

فراست ؛

خطرے کے وقت ہوش حواس قائم رکھنا اور اپنے بچاؤ کی کوئی عمدہ تدبیر سوچ لینا اعلیٰ درجے کی بہادری ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے مولینا کی ذات میں یہ خوبی خاص طور سے تھی۔ جس زمانے میں آپ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے گئے تھے، انہی دنوں کا واقعہ ہے ایک انگریز افسر آپ کو گرفتار کرنے کے لئے خاص آپ کے

پاس پہنچ گیا اور خود آپ ہی سے پوچھا کہ مولوی محمد قاسم کدھر ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ آپ کی شکل صورت سے آشنا نہیں تھا۔

کوئی اور ہوتا تو ایسے نازک وقت میں گھبرا جاتا لیکن حضرت مولانا نے پوری طرح حواس قائم رکھتے جس جگہ آپ کھڑے تھے اس جگہ سے دو قدم ہٹ کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ وہ ابھی ابھی تو اسی جگہ کھڑا تھا۔

یہ بات سن کر انگریز افسر چلا گیا۔ اور آپ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔

حج کا سفر:

جن دنوں انگریزی حکومت نے آپ کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری کر رکھے تھے۔ آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور اللہ پاک نے اس بارے میں آپ کی امداد فرمائی۔ کہ اس لمبے سفر کا نہایت آسانی سے انتظام ہوگیا اور آپ صحیح سلامت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہ ۱۲۷۳ھ کا واقعہ ہے۔

اس مبارک سفر میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔ جب آپ تشریف لائے تو انگریزی حکومت پوری طرح حالات پر قابو پا چکی

تھی اور عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب آپ سے بھی باز پرس نہ کی گئی ہے۔

حقیقی خطرہ:

صرف انگریزوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ ایک پکا قانون ہے کہ جب کوئی قوم کسی کمزور قوم پر قابو پا لیتی ہے تو یہ کوشش کرتی ہے کہ اب یہ قوم ہمیشہ محکوم رہے۔ ہندوستان پر قبضہ کر کے انگریزوں نے بھی یہی چاہا کہ اب یہ سرسبز و شاداب ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری محکومی میں رہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے انگریز مدبروں نے یہ سوچا۔ کہ جس طرح بھی ہو سکے ہندوستانیوں کو انگریزی تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ انہیں یقین تھا جب یہ لوگ ہماری زبان، ہمارا لباس اور ہمارا مذہب اختیار کر لیں گے تو پھر ان کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کی امنگ کبھی پیدا نہ ہو گی۔

اگرچہ اس زمانے میں یہ منصوبہ اونچے درجے کے انگریز افسروں اور سیاستدانوں کے سینوں ہی میں محفوظ تھا اسے ظاہر نہ کیا گیا تھا لیکن اپنی روحانی طاقت اور دینی بصیرت سے حضرت مولانا نے یہ بات بھانپ لی۔ کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کی طرف سے ذرا بھی غفلت

برتی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر ملکی غلامی کے جنگل میں پھنس جائیں گے اور ان کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گی۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

سامنے نظر آنے والے حالات اور آئندہ کے خطرات کا پوری طرح اندازہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے دیوبند کے مقام پر ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ فرمایا اور غریبانہ طور پر جو سامان بھی فراہم کیا جا سکتا تھا۔ جمع کر کے ۱۲۸۳ھ میں اس مبارک دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی جس نے دین کے بجھتے ہوئے چراغ کو پھر روشن کر دیا۔ اور جس کی نورانی کرنوں سے افغانستان، ایران، مصر، شام، انڈونیشیا اور حجاز تک کے طالبانِ علم فیض یاب ہوئے اور انشاء اللہ یہ فیض آئندہ بھی جاری رہے گا۔

قرآن اور حدیث کی تعلیم پھیلانے کے علاوہ دارالعلوم دیوبند سے ایک فیض یہ جاری ہوا کہ اس کے طلبا۔ اور اساتذہ نے آزادیٔ وطن کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑی خدمت یہ کی کہ مسلمانوں میں جو غلط عقیدے پھیل گئے تھے ان کی اصلاح کی۔

اس سلسلے میں بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ جو لوگ اس دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں ان کا عقیدہ ٹھیک نہیں رہتا۔ نعوذ باللہ وہ حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عزت نہیں کرتے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس میں ذرا سی اصلیت بھی نہیں موٹی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے۔ کہ جو ادارہ قائم ہی اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لئے کیا گیا ہو وہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عزت اور عظمت کا قائل کیوں نہ ہو گا۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک حضور صلعم کو اللہ کا سچا رسول نہ مانے اور آپ کی عظمت کا قائل نہ ہو اور آپ سے محبت نہ کرے۔

ہاں علمائے دیوبند نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ حضور صلعم کی ذاتِ اقدس سے محبت کو قرآن اور حدیث کے مطابق رکھا ہے۔ اور یقیناً یہ ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے۔ اگر ہم دوسرے مذاہب کے بگڑنے کی وجوہات پر غور کریں تو معلوم ہو گا سب سے بڑی وجہ ان کے بزرگوں سے جاہلانہ محبت ہی تھی۔ یہ لوگ اپنے رسولوں اور نبیوں کی محبت میں اس حد تک بڑھ گئے، کہ اللہ کو چھوڑ کر انہی کو پوجنے لگے۔ بہر حال یہ عقیدے کا معاملہ ہے اگر کوئی شخص دیوبند کے علماء سے عقیدت نہ بھی رکھے پھر بھی یہ بات تو تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے کہ اس

دارالعلوم نے سو سال کے عرصے میں قرآن اور حدیث کی تعلیم پھیلانے میں شاندار خدمات انجام دی ہیں اور انشاءاللہ یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا۔

وفات :

۴ جمادی الاوّل ۱۲۹۷ھ کو بدھ کے دن حضرت مولینا کا انتقال ہوا۔ آپ اپنے ایک عزیز دوست کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے، اسی سفر میں آپ علیل ہوگئے اور چند دن بیمار رہ کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔

اللہ پاک جنت میں انہیں اونچا درجہ عطا کرے اور ان کے جاری کئے ہوئے اس چشمۂ فیض کو جاری رکھے۔ آمین۔ ان کی ذات ہم سب کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے۔

سر سیّد احمد خاں

سر سید احمد خاں اسلام کے ان نامور فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے اس مذہب کی ترقی اور حفاظت کے لئے شاندار خدمات انجام دیں اور مسلمان قوم کی آزادی اور عزت کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔

برصغیر ہند و پاک میں جب مسلمانوں کی سلطنت کو زوال ہوا اور سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز اس ملک کے مالک بن گئے تو مسلمانوں کی حالت بہت مخدوش ہو گئی۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہ کہیں یہ قوم ہندوستان کے سات کروڑ اچھوتوں کی طرح بالکل تباہ نہ ہو جائے۔ یہ خطرہ یوں پیدا ہوا تھا۔ کہ انگریزوں نے

مسلمانوں کو اپنا دشمن جان کر انہیں ہر طرح سے مٹانے اور ذلیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کا ذکر آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اپنے ملک کو آزاد رکھنے کے لئے یہ اس ملک کے شریف اور خود دار لوگوں کی ایک منظم کوشش تھی اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے بعض اسباب کی بنا پر یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اپنے وطن کو آزاد رکھنے کے لئے کوشش کرنے والے ہار گئے اور انگریز جیت گئے۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور انتظام درست کرنا چاہا تو اس بات پہ بھی غور کیا کہ سنہ ۱۸۵۷ء میں شروع ہونے والی اس فوجی بغاوت کے اصل اسباب کیا تھے؟ اور اس سلسلے میں اُن کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اصل میں ساری گڑبڑ مسلمانوں نے کی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ اس قوم کے سخت دشمن بن گئے اور انہوں نے اپنی یہ پالیسی بنالی کہ جہاں تک ہو سکتا ہے مسلمانوں کو کمزور کیا جائے۔

انگریزی حکومت کی اس پالیسی کے علاوہ خود مسلمان بھی اس نئی حکومت سے نفرت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اگر ہم نے اس حکومت سے سمجھوتہ کر لیا اور اس کا انتظام چلانے میں مدد دی تو

رفتہ رفتہ ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب مٹ جائے گی۔

یہ مسلمانوں کا نرا وہم تھا بلکہ اس زمانے میں انگریزوں کی واقعی یہی پالیسی تھی، ایک طرف عیسائی پادری زور شور سے عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے اور دوسری طرف حکومت نے سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کا جاننا اور انگریزی وضع کا لباس پہننا ضروری قرار دے دیا تھا اور یہ ساری باتیں ان لوگوں کو پریشان کرنے والی تھیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے محبت کرتے تھے۔

دوسری طرف ہندوؤں کا یہ حال تھا۔ کہ وہ ساری باتیں بھلا کر ایک طرح انگریز کی گود میں جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان کو بھی قبول کر لیا تھا اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ اگر ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں کے لوگ ہندو اور مسلمان مل کر یہ فیصلہ کرتے۔ کہ ہم اس نئی غیر ملکی حکومت سے سمجھوتہ نہ کریں گے اور اس کا کاروبار چلانے میں مدد نہ دیں گے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے کے باوجود یہ ملک غلام ہونے سے بچ سکتا تھا۔ کیونکہ چند ہزار انگریز اتنے بڑے ملک کا انتظام نہ سنبھال سکتے تھے لیکن جب ہندو قوم نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو گویا کلہاڑی کو دستہ مل گیا۔ انگریزوں کو اب اس بات کی پرواہ نہ رہی کہ مسلمان

ان کا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں۔ بلکہ انہوں نے خود یہ پالیسی بنالی کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو سرکاری نوکریاں نہ دی جائیں۔ ان کی زمینداریوں کو تباہ کر دیا جائے اور تجارت کے میدان میں بھی آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

یہ حالات انتہائی خطرناک تھے۔ ایک طرف انگریزی حکومت کی یہ پالیسی کام کر رہی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا۔ کہ ہم انگریزوں کے ساتھ کسی قیمت پر تعاون نہ کریں گے مسلمانوں کا یہ فیصلہ یقیناً خودداری اور شرافت کا فیصلہ تھا اور ہمیں اپنے بزرگوں کی اس دور اندیشی اور بہادری پہ ناز کرنا چاہیئے لیکن زمانے کے حالات کچھ اس طرح بدل گئے تھے۔ کہ اس اصول پر جمے رہنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔ انگریزوں نے پورے ملک پر قبضہ کر کے اچھی طرح اپنے پاؤں جما لئے تھے۔ پولیس اور فوج کے محکمے پوری طرح مضبوط ہو گئے تھے اور ان کے دفتروں میں باقاعدگی سے کام ہونے لگا تھا۔ ایسی مضبوط حکومت کے خلاف رہ کر نہتی رعایا کیا فائدہ اٹھا سکتی تھی اور اپنی جنگ کو کس طرح جاری رکھ سکتی تھی صاف نظر آتا تھا۔ کہ آزادی چاہنے والوں کو جس طرح ۱۸۵۷ء میں ہتھیاروں کی لڑائی میں شکست ہو گئی تھی۔ اس طرح اس مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی جنگ

میں بھی شکست ہو جائے گی۔

ایسے نازک حالات میں سر سید احمد خاں نے اپنی قوم کو تباہی کے بھنور سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ سارے پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان کی سمجھ میں یہ بات آئی۔ کہ اب مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ انگریزی زبان سیکھ کر حکومت کے اونچے عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بعض لوگ ان کے اس فیصلے کو ان کی کمزوری خیال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنے کا مشورہ دے کر اپنی قوم کے ساتھ دشمنی کی، لیکن یہ بات ٹھیک نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ سر سید اپنی قوم کے سچے خیر خواہ تھے، انہوں نے جو کچھ کیا مسلمانوں کی بھلائی کے لیے کیا۔ بلکہ اس لحاظ سے انہیں اس قوم کا بہت بڑا محسن خیال کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے بارے میں انگریز حکمرانوں کی غلط فہمیاں دور نہ کر دیتے اور دن رات محنت کر کے ان کے لیے جدید تعلیم حاصل کرنے کا انتظام نہ کرتے تو اس ملک کے مسلمان سخت نقصان اٹھاتے، ہو سکتا ہے ان کی حالت رفتہ رفتہ اچھوتوں جیسی ہو جاتی۔

اس سلسلے میں سر سید کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں

نے علی گڑھ میں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے ایک شاندار یونیورسٹی قائم کی اس کے علاوہ نہایت عمدہ اصلاحی مضمون لکھ کر انہیں خواب غفلت سے بیدار کیا اور جو غیر مسلم مسلمانوں کو اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ اور اپنی قابلیت سے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

بچپن :

سر سید، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی کے ایک معزز سید خاندان میں پیدا ہوئے ان کے والد صاحب کا نام میر متقی تھا اور وہ عالم فاضل ہونے کے علاوہ خوش حال آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے اس بچے کا نام سید احمد رکھا۔

ایک روایت کے مطابق سید احمد بچپن ہی سے خوب توانا اور تندرست تھے، ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے انہیں پہلی بار دیکھا تو کہا۔ یہ ہمارے خاندان میں جاٹ کہاں سے پیدا ہو گیا۔

سر سید صرف موٹے تازے ہی نہ تھے بلکہ ذہین اور علم حاصل کرنے

لے یہ روایت مولانا محمد حسین آزاد نے بیان کی ہے۔

کے شوقین بھی تھے۔ انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں عربی، فارسی کی مروجہ تعلیم کے علاوہ طب یعنی علاج معالجے کا علم بھی پڑھ لیا۔ قرآن حکیم شاہ عبدالعلی سے پڑھا۔ عربی فارسی کی تعلیم مولوی حمیدالدین سے حاصل کی اور طب حکیم غلام حیدر سے پڑھی۔

عزت والی ماں:

دنیا میں جن لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ان کے حال میں یہ بات لازمی طور پر آتی ہے کہ ان کی مائیں بہت زیادہ نیک اور اپنی اولاد کو اچھا بنانے کا جذبہ رکھنے والی تھیں۔ سرسید کی والدہ محترمہ کے بارے میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے۔ ان کے دل میں شرافت اور نیکی کی کس قدر اہمیت تھی اور وہ اپنے پیارے بیٹے کو کیسا با اخلاق، قابل اور شریف دیکھنا چاہتی تھیں اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے:

کہتے ہیں بچپن کی عمر میں ایک دن سرسید نے گھر کے ایک ملازم کو ڈانٹ دیا۔ ان کی والدہ صاحبہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اس قدر ناراض ہوئیں کہ انہیں گھر سے نکال دیا۔ اور اس وقت تک گھر میں آنے کی اجازت نہ دی جب تک انہوں نے نوکر سے معافی نہ مانگی اور آئندہ کے لیے ایسی غلطی نہ کرنے کا پکا وعدہ نہ کیا۔

ملازمت :

چونکہ سرسید کا خاندان مالی لحاظ سے اچھا خاصا آسودہ تھا۔ اس لئے تعلیم سے فارغ ہونے کے باوجود انہوں نے ۲۲ سال کی عمر کو پہنچنے تک کہیں ملازمت نہ کی۔ روزگار کی جستجو انہیں اس وقت کرنی پڑی جب ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ ایک فوجداری عدالت میں سررشتہ دار مقرر ہوئے لیکن اپنی قابلیت اور محنت و دیانت داری کے باعث بہت جلد مجسٹریٹ کے عہدے تک جا پہنچے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت دہلی کے لال قلعے تک رہ گئی تھی۔ کہنے کو وہ شہنشاہِ ہندوستان کہلاتے تھے لیکن ملک کا سارا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

کچھ بعض انگریزوں کی بے تدبیری اور تعصب کی وجہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ ہم رفتہ رفتہ ایک غیر قوم کے غلام بن رہے ہیں۔ عام ہندوستانی انگریزی حکومت سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ اس نفرت کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کا غدر رونما ہوا۔ مئی کے مہینے میں میرٹھ کی چھاؤنی میں مقیم ہندوستانی فوج نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے۔

اور پھر یہ شورش پورے ملک میں پھیل گئی ۔

غدر کے ہنگامے میں سرسید کی خدمات

ایسے نازک حالات میں جب انگریزوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا تھا سرسید نے نہایت بہادری سے بہت سے انگریزوں کی جان بچائی وہ ان دنوں بجنور میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے ۔

دیکھا جائے تو سرسید کا یہ کام یعنی انگریزوں کو پناہ دینا اپنے ملک اور قوم کے عام مفاد کے خلاف تھا اور اسی بنا پر بعض لوگوں نے اُن سے نفرت بھی کی ہو گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ فعل ان کی شرافت اور انسان دوستی کا ثبوت ہے ۔ ایک سچے مسلمان کا اخلاق یہ ہے کہ وہ کسی بے گناہ انسان کا دشمن نہیں بنتا چاہے وہ شخص کسی بھی قوم اور کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو ، بلکہ اسلام کی تعلیم کی رو سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے ۔ کہ وہ مظلوم کی حمایت کرے اور اسے مصیبت سے بچائے ۔

اس میں کوئی شک نہیں ۔ کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے انگریز سیاستدان بڑی بڑی بے ایمانیاں کر رہے تھے اور ان کا یہ ارادہ بھی ظاہر ہو گیا تھا ۔ کہ اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس

ملک کے باشندوں کے مذہب، زبان اور تہذیب کو بدل دیں گے لیکن تمام انگریز اس سازش میں شریک نہ تھے۔ خاص طور سے عورتوں اور بچوں کو تو ان معاملات سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور خاص بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ انگریزوں سے حکومت کا اختیار چھین کر پھر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بھی زیادہ ایسے تھے جو اخلاق، عادات اور خیالات کے لحاظ سے ویسے اونچے درجے کے انسان نہ تھے جیسا حکومت کرنے والے لوگوں کو ہونا چاہیئے۔ یقین ہے۔ سرسید کے دماغ میں یہ بات بھی ہو گی۔ بہر حال اصلیت تو اللہ پاک ہی کو معلوم ہے۔ تاریخی طور پر یہ بات سب مانتے ہیں۔ کہ غدر کے دنوں میں انہوں نے بہت سے انگریزوں کی جان بچائی اور ان کی اس دوستی اور خیر خواہی سے خوش ہو کر انگریزی حکومت نے ان کی عزت افزائی کی۔ انہیں خلعت عطا کی گئی اور دو سو روپیہ روپے وظیفہ مقرر ہو گیا۔

قوم کی خواہی :

سرسید کی کہانی میں یہاں تک تو ان کی ذاتی اچھائیوں کا حال آتا ہے اور یہ بات ملتی ہے۔ کہ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے اور اپنے خاندان

کے فائدے کے لئے کیا، لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی زندگی میں
ان کی شخصیت بہت بدلی ہوئی نظر آتی ہے، وہ ایک بہت بڑے مدبر،
کامیاب لیڈر اور سچے دل سے اپنی قوم کا بھلا چاہنے والے شاندار
مسلمان نظر آتے ہیں۔

ہم یہ بات شاید پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ جب انگریزوں نے
دلی پر قبضہ کر لیا اور ان کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے اس بات پہ
غور کیا۔ کہ ان کے خلاف نفرت اور غصے کا یہ لاوا کیوں ابلا؟ اور اس
سلسلے میں ان کی سمجھ میں یہ بات آئی یا چالاکی سے انہیں یہ بات سمجھا
دی گئی۔ کہ یہ ساری شرارت مسلمانوں کی تھی۔ چنانچہ اس بات کی بنا پر
انگریزی حکومت مسلمانوں کی دشمن بن گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس
قوم کو ہر لحاظ سے بالکل ناکارہ بنا دیا جائے۔

ذاتی طور پر سر سید کی پوزیشن ایسی تھی۔ کہ انہیں ہر قسم کی عزت
اور آسائش حاصل ہو گئی تھی۔ اگر وہ خود غرض اور جاہ پسند ہوتے تو
انگریزوں کے معاون و مددگار رہ کر ترقی کرتے چلے جاتے۔ لیکن اپنی
قوم کو مصیبت میں دیکھ کر انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا۔ جس میں سراسر
تکلیفیں ہی تکلیفیں تھیں۔

اسبابِ بغاوتِ ہند:

اس سلسلے میں سرسید کا ایک بہت بڑا کارنامہ ان کی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے نہایت جرأت سے یہ بات ثابت کی۔ کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو جس آگ میں جلنا پڑا وہ دراصل خود انہی کی سلگائی ہوئی تھی۔ واقعات کی شہادت سے انہوں نے ثابت کیا۔ کہ عیسائی پادریوں اور تنگ دل انگریز افسروں نے طاقت کے نشے میں اندھے ہو کر اس ملک کے اصلی باشندوں کو ذلیل کرنا چاہا ان کے مذہب پر حملہ کیا اور ۱۸۵۷ء کا غدر ان کی اسی غلط پالیسی کی وجہ سے رونما ہوا

اس کتاب کے مدلل اور معقول ہونے کی وجہ سے انصاف پسند انگریز قائل ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے کی ضرورت محسوس کی۔

سرسیّد کا دوسرا بڑا کارنامہ:

انگریزی حاکموں کے تعصب، غصے یا غلط فہمی کے علاوہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ کے سلسلے میں ایک اور بڑی دشواری خود مسلمانوں

کا طرزِ عمل تھا حکومت چھن جانے کے بعد بھی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ کہ اگر ہم نے انگریزوں کے ساتھ تعاون نہ کیا تو وہ حکومت کا کام نہ چلا سکیں گے اور انہیں بوریا بستر لپیٹ کر بھاگنا پڑے گا۔ اپنی اسی غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔

اسباب بغاوتِ ہند کے ذریعے انگریزوں کی رائے بدلنے کے بعد سر سید نے اپنی قوم کی طرف توجہ دی اور تحریروں اور تقریروں کے ذریعے انہیں یہ بات سمجھائی۔ کہ اب ان کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ انگریزوں کی حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔

سر سید کا یہ کام بے حد مشکل تھا۔ عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے اس ظلم و ستم کے باعث جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا مسلمانوں کی اکثریت انہیں اپنا دشمن خیال کرتی تھی اور یہ یقین رکھتی تھی۔ کہ وہ ان کا مذہب خراب کر دیں گے اور ان کی باتیں اپنانے سے ان کے اندر بے حیائی پھیل جائے گی لیکن سر سید احمد خاں نے لوگوں کو نہایت قابلیت سے یہ بات سمجھائی۔ کہ اگر تم نے زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دیا تو وہ دونوں باتیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی جن سے تم ڈرتے ہو۔ ان کی دلیل یہ تھی۔ کہ ایک

محکوم قوم طاقتور حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ غربت ایک بہت بڑا عذاب ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو مصیبت اور آزمائش میں بھی اپنے ایمان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

رفتہ رفتہ مسلمانوں کی سمجھ میں سرسید کی بات آئی اور سرسید نے مسلمان بچوں کو جدید علوم سکھانے کے لئے ایک کالج قائم کرنے کے لئے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت زیادہ محنت کی اور حد سے زیادہ تکلیف اٹھائی۔ لوگوں نے انہیں طعنے دیئے، ان کا مذاق اڑایا۔ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں لیکن انہوں نے کسی بات کی پروا نہ کی اور ان کے اس استقلال اور خلوص کی وجہ سے بالآخر ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ کے مقام پر کالج کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہی کالج آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والے مسلمان نوجوانوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کر کے اپنی قوم کو تباہی کے بھنور سے نکالا۔

سرسید کی دینداری:

سرسید انگریزوں سے گہرا میل جول رکھتے تھے اور انہوں نے رہن سہن کے سلسلے میں ان کی بہت سی باتوں کو اپنا لیا تھا لیکن اس کے

باوجود وہ پکے سچے مسلمان تھے اور یہ بات برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص ان کے مذہب پر حملہ کرے۔ انہیں اپنی قوم سے سچی محبت تھی اور انہوں نے مسلمانوں کی بھلائی کے کاموں کو ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا تھا۔

ان کے دل میں کس درجہ دینی غیرت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خاص انگلستان میں بیٹھ کر انہوں نے "خطباتِ احمدیہ" جیسی کتاب تصنیف کی جس میں عیسائی مبلغین کے اعتراضات کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دینداری کا ایک اور بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی تعلیم کا بھی انتظام کیا اور کوٹ پتلون کی جگہ طلباء کی یونیفارم میں شیروانی اور پاجامے کو جگہ دی۔ انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مغربی علوم اور انگریزی زبان سیکھ کر مسلمان نوجوانوں کا قومی مزاج نہ بدل جائے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ مسلمان اول و آخر مسلمان رہیں اور اونچے سے اونچا عہدہ پا کر بھی اپنی قوم کے وفادار رہیں۔

اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے لیکن پھر بھی اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ علیگڑھ کے طلباء پر انگریزی

تہذیب کا ویسا رنگ نہیں چڑھ سکا جیسا ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں پر چڑھا۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلباء میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، سردار عبدالرب نشتر، نوابزادہ لیاقت علی خان، ڈاکٹر ذاکر حسین اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان جیسے شاندار لوگ نکلے جنہوں نے اپنی قوم کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا۔

اصلاحی سرگرمیاں:

تعلیمی میدان میں شاندار خدمات انجام دینے کے علاوہ سرسید نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے بھی شاندار کام کیا۔ مسلمانوں میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کی اصلاح کے لیے انہوں نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس رسالے میں مستقل طور پر خود بھی نہایت مفید مضامین لکھے اور دوسرے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں سے بھی اصلاحی اور قومی مضامین لکھوائے۔ چنانچہ ہمارے مشہور قومی شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور مسدس مدوجزر اسلام کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ شہرۂ آفاق نظم انہوں نے سرسید کی خواہش کے مطابق ہی لکھی تھی۔ نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ

ہماری قوم کے بہت بڑے بڑے عالم مؤرخ اور ادیب سرسید کے ساتھیوں میں تھے۔

ان کاوشوں اور کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں اپنی حالت سنوارنے کا عام جذبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے بری رسوم کو ترک کیا غلط قسم کے رواجوں سے پیچھا چھڑایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قوم میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

وفات:

ایسی شاندار قومی خدمات انجام دیتے ہوئے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو مسلمانوں کے اس محسن اور بہی خواہ کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار علیگڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں ہے اور آج بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ میرے اندر جس عظیم الشان انسان کا جسدِ خاکی آرام کر رہا ہے اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کی بقا اور اسلام کی سربلندی تھا۔

ہمیں سچے دل سے دعا کرنی چاہیئے اللہ پاک ان کے نیک کاموں کو قبول فرمائے جنت میں انہیں اونچا درجہ دے اور ہمیں ان کی طرح اسلام کا دلدادہ و شیدا بنائے۔ آمین۔

مولانا محمد علیؒ جوہر

اسلامی تاریخ میں جن بڑے آدمیوں کے نام سنہری حرفوں میں لکھنے کی ضرورت ہے۔ اُن میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور بھی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہو گا۔ کہ برصغیر ہند و پاک کو ۱۹۴۷ء میں جو آزادی نصیب ہوئی ہے۔ وہ بڑی حد تک مولانا مرحوم ہی کا صدقہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہماری قوم میں آج جو سیاسی سوجھ بوجھ، اپنے مذہب اسلام سے گہرا لگاؤ اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں سے پیار اور ہمدردی کا سچا جذبہ ہے وہ بھی اسی مخلص لیڈر کا دیا ہوا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سیدؒ کے ذکر میں ہم یہ بات بتا چکے

ہیں۔ کہ جب انگریزوں نے ہندوستان پر مکمل قبضہ کر لیا تو مسلمان قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ ہمارے علماء نے یہ راستہ اختیار کیا۔ کہ انگریزی حکومت کو کسی کام میں مدد نہ دی جائے مسلمان اپنے مذہب کی باتوں کو پوری طرح سیکھیں اور اس غیر ملکی حکومت کو ختم کر کے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ پھر ہماری قومی حکومت قائم ہو جائے۔

دوسرا گروہ انگریزی حکومت کو ایک زبردست طاقت خیال کرتا تھا اس کے نزدیک اب مسلمانوں کا فائدہ اسی میں تھا۔ کہ وہ انگریزی زبان سیکھ کر سرکاری دفتروں میں عہدے حاصل کریں اور انگریزوں کو یہ یقین دلائیں کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی ان کی وفادار رعایا ہیں۔

ظاہر ہے انگریزی حکومت کی ہمدردی مسلمان قوم کے اس دوسرے گروہ کے ساتھ تھی اور چونکہ ساری طاقت انہی کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے ان دوستوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، ان کے وظیفے مقرر کئے اور جاگیریں دیں۔

اگرچہ ظاہری طور پر یہ نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ گروہ جس کے لیڈر سرسید مرحوم و مغفور تھے کم ہمت اور دنیا پرست تھا لیکن حقیقت یہ نہیں، ہمارے نزدیک انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا اور ان کی زبان سیکھنا ان لوگوں کی ایک اچھی تدبیر تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان

اسی طرح انگریزوں کے دشمن بنے رہے اور وہ انہیں واقعی اپنا مخالف خیال کرتے رہے تو مسلمان پس جائیں گے اور کچھ عرصہ بعد ہی اُن کی حالت اچھوتوں کی سی ہو جائے گی۔ اُن کے ذہن میں یقیناً یہ بات تھی کہ اپنی مالی حالت درست کرنے کے بعد ہم اپنے مذہب کی حفاظت زیادہ بہتر طریقے سے کر سکیں۔

دوسری طرف انگریز بھی ایسے نادان نہ تھے۔ انہوں نے ساری باتوں کو سمجھتے ہوئے ایسا انتظام کیا۔ کہ جو لوگ اپنی قوم سے کٹ کر ان سے آ ملے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے ہی ہو کر رہ جائیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے خالص مسلمانوں کے چندوں سے قائم ہونے والے تعلیمی اداروں میں بھی ہوشیار انگریزوں کو داخل کیا اور یہ پابندی لگائی۔ کہ ان اسکولوں اور کالجوں میں صرف وہی کورس پڑھایا جائے جس کی حکومت منظوری دے۔

انگریزی حکومت کی یہ پالیسی بے حد کامیاب رہی۔ حکومت کے دفتروں میں بھرتی ہونے والے یہ مسلمان اپنی نیک نیتی اور اچھی خواہشوں کے باوجود آہستہ آہستہ اپنی قوم سے کٹتے گئے اور اپنے مذہب سے اُن کی وفاداری کمزور ہوتی گئی اور پچاس ساٹھ سال کے معمولی سے عرصے ہی میں مسلمان قوم کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو مردم شماری

کے خانے میں تو اپنا مذہب اسلام ہی لکھتا تھا اور اسے اپنے مسلمان ہونے پر فخر بھی تھا لیکن اعمال اور خیالات کے لحاظ سے اُس نے اسلام سے کوئی واسطہ نہ رہ گیا تھا۔ ان لوگوں کے دلوں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جگہ لندن کی قدر زیادہ تھی اور وہ اپنے بزرگوں کے مقابلے میں یورپ کے لادین فلسفیوں اور ادیبوں کو زیادہ قابل ماننے لگے تھے۔ ہمارے مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے ؎

گیا ہے شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھے گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

حضرت مولانا محمد علیؒ جوہر ابتدا میں اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے اُن کے دل کو یوں بدل دیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی اور آکسفورڈ لندن سے اعلیٰ ڈگریاں لے کر انگریزی حکومت کا پرزہ بن جانے کی جگہ انہوں نے اپنی غریب قوم کی حالت سدھارنے کا عزم کیا اور خود کو اپنے مقدس مذہب اسلام کی عظمت بڑھانے اور حفاظت کرنے کے لیے وقف کر دیا۔

اس بڑے کام میں ان کے بھائی مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور اور ان کی محترم والدہ صاحبہ بھی اُن کی ساتھی بنیں۔ اس لحاظ سے حضرت

مولانا محمد علی جوہر کی کہانی دراصل تین شخصیتوں کی اکٹھی کہانی ہے، بلکہ اُن سب عزت والے بہادر مسلمانوں کی کہانی ہے جنہوں نے دنیاوی فائدوں اور عیش و عشرت کو چھوڑ کر اپنے مذہب اور اپنی قوم کے لئے اَن گنت تکلیفیں برداشت کیں۔

قابلیت اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے بھی مولانا بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ وہ جادو نگار ادیب تھے، بلند پایہ شاعر تھے۔ بے مثل خطیب تھے اور سیاسی تحریکوں کو چلانے کی بے پناہ قوت رکھتے تھے۔

آیئے اب ہم آپ کو اسلام کے اِس جلیل القدر فرزند کی کہانی سنائیں!

خاندان:

مولانا محمد علیؒ جوہر نسلاً پٹھان تھے۔ اُن کے بزرگ درۂ خیبر پار کر کے آنے والے فاتح لشکروں کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہاں مشہور ریاست رامپور میں سکونت اختیار کی۔ اِس ریاست پر ایک پٹھان خاندان حکومت کرتا تھا۔ مولانا کے بزرگ دربار سے وابستہ تھے اور ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ خوش حال ہونے کے علاوہ اس

خاندان میں علم و ادب کا بھی خوب چرچا تھا۔

ایسے خوش حال اور علم پرور خاندان میں مولانا نے ۱۸۷۸ء میں جنم لیا۔ اُن کے دو بھائی اور تھے۔ ان تینوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں اُن کی محترم والدہ کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ اس شیر دل خاتون کو ہماری تاریخ میں بی اماں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے خلافت کی تحریک میں مردوں سے بڑھ کر کام کیا۔

تعلیم :

مولانا نے ابتدائی تعلیم رامپور میں حاصل کی۔ اس کے بعد ایک قریبی شہر بریلی کے ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ اس اسکول میں دو سال رہے اور پھر علی گڑھ آ گئے۔ اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا تعلیمی ادارہ تھا سر سید اور ان کے مخلص ساتھیوں نے یہاں نہایت اچھا تعلیمی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ استاد بھی قابل تھے اور طلبا کو ہر قسم کی سہولتیں بھی میسر آتی تھیں۔ ایسی عمدہ فضا میں مولانا محمد علی جوہر کے جوہر خوب نمایاں ہوئے کھیل کے میدان میں بھی اُن کا خوب نام تھا اور ادب کی محفلوں میں بھی انہیں خوب داد دی جاتی تھی۔ بی۔ اے کے امتحان میں وہ

یونیورسٹی میں اوّل رہے۔

ایسے اعزاز سے بی۔اے کرنے کے بعد مولانا لندن تشریف
لے گئے اور وہاں کے شاندار تعلیمی ادارے آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔
ایک لائق طالب علم اور اونچے کردار کے نوجوان کی حیثیت سے اُن
کی شہرت یہاں بھی برقرار رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے
میں مولانا انگریزی وضع کا لباس پہنتے تھے۔ اور ان کے رہنے سہنے
کے طریقے بھی انگریزوں جیسے تھے۔ لیکن ان کا دل پکا مسلمان تھا،
ان کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا
ہو کہ فلاں بات میں انہوں نے اپنے مذہب کے خلاف عمل کیا۔

ریاست بڑودہ کی ملازمت :

تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا وطن تشریف لائے تو ریاست
بڑودہ کے راجہ صاحب نے انہیں اپنی ریاست میں جج کے عہدے
پر مقرر کیا۔ اس کے بعد ترقی دے کر ڈپٹی کمشنر بنا دیا۔ اگرچہ مولانا
کی یہ زندگی ہر لحاظ سے شاندار تھی۔ رہنے کے لئے آراستہ کوٹھی ملی
ہوئی تھی۔ خدمت کے لئے نوکر چاکر مقرر تھے اور تنخواہ بھی معقول تھی۔
کوئی معمولی درجے کا آدمی ہوتا تو ساری زندگی اسی نوکری کے چکر میں

گذار دیتا۔ لیکن مولانا اس چمکیلی، بھڑکیلی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ اُن کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ اپنے پیارے وطن کی آزادی اور اپنی غریب قوم کی عزت کے لئے کام کریں۔ اس سلسلے میں وہ ہندوستان کے اونچے درجے کے اخباروں میں مضامین لکھتے رہتے تھے اور یہ مضامین نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

اتفاق سے انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ مولانا نے اس اچھی ملازمت کو لات مار کے اپنا سارا وقت قوم اور ملک کی خدمت میں صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ ان کے محکمے میں ایک غیر مسلم افسر رکھا گیا۔ یہ افسر بہت متعصب اور مسلمانوں کو کم درجے کا جاننے والا تھا۔ ایک دن اُس نے مشہور مسلمان بادشاہ حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ اگرچہ عہدے کے لحاظ سے وہ مولانا سے بڑا تھا، لیکن مولانا اس کی اِس گستاخی کو برداشت نہ کر سکے، اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اس وجہ سے وہ آپ کا مخالف بن گیا۔ مولانا کے دل میں اس ملازمت کی قدر ہوتی تو بڑا افسر ہونے کے باوجود وہ آپ کا بال بیکا نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ تو پہلے ہی دل برداشتہ تھے، لہٰذا نوکری چھوڑ دی۔

کامریڈ کا اجرا:

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مولانا نے کلکتہ سے انگریزی زبان کا اخبار کامریڈ جاری کیا۔ اگرچہ بمبئی اور کلکتہ سے انگریزی زبان میں کئی اچھے اخبار نکلتے تھے لیکن کامریڈ ان سب سے بازی لے گیا۔ اس کامیابی کی خاص وجہ یہ تھی کہ مولانا انگریزی زبان میں بہت زیادہ قابلیت رکھتے تھے، اس کے علاوہ اُن کے دل میں اپنے وطن اور اپنی قوم کا سچا درد تھا۔ وہ جو مضمون بھی لکھتے تھے لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا۔ کامریڈ کی کامیابی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی حکومت کے بڑے بڑے افسر اور بڑے بڑے انگریز ادیب اس اخبار کو نہایت شوق سے پڑھتے تھے اور اس کی فائلیں محفوظ رکھتے تھے۔ ایک انگریز افسر کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جب وہ ریٹائر ہوکر اپنے وطن انگلستان گیا تو اپنے ایک اخبار نویس دوست کے لیئے کامریڈ کی فائیل تحفے کے طور پر لے گیا۔ اس نے خود مولانا سے یہ بات کہی کہ میں اپنے اس دوست کے لیئے ہندوستان سے اس سے اچھا تحفہ نہیں لے جا سکتا۔

ہمدرد:

جس زمانے میں کامریڈ جاری کیا گیا ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ تھا لیکن چونکہ یہ شہر صوبہ بنگال میں ہندوستان کے ایک کنارے پر تھا اور حکومت کے افسروں کو ملک کے انتظام میں دشواری ہوتی تھی اِس لئے آگے چل کر کلکتہ کی جگہ دلی کو دارالحکومت بنایا گیا اور اس تبدیلی کی وجہ سے مولانا کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی، کہ اپنے اخبار کا دفتر کلکتہ سے دلی لے جائیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ سے دلی آنے کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا عام پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے لئے اردو زبان میں بھی ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے چنانچہ آپ نے "ہمدرد" کے نام سے ایک اردو اخبار جاری کیا اور یہ اخبار بھی پوری آن بان اور ٹھاٹ باٹ سے نکالا۔

اخبارات ہمارے موجودہ زمانے میں بھی نکلتے ہیں بلکہ اُن کی گنتی کہیں زیادہ ہے اور خرچ اخراجات اور خوشنمائی کے لحاظ سے بھی پہلے اخبارات سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے۔ کہ ہماری قوم اور ہمارے وطن کو جو فائدہ مولانا محمد علی جوہر کے اِن دونوں اخباروں سے پہنچا۔ اس کا ان اخباروں کے ساتھ

تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ اخبار نکالنے کا جو صحیح مقصد ہے مولانا نے ہمیشہ اُسے پیش نظر رکھا اور ان دونوں اخباروں کو یورپ کے اعلیٰ درجے کے اخبارات کے برابر پہنچا دیا۔ ہر معاملے میں سچائی، بہادری اور دانشمندی سے قوم کی رہنمائی کرنا اور حکومت کو اُس کے غلط کاموں پر ٹوکنا ان اخبارات کا طرۂ امتیاز تھا۔ اگرچہ مولانا کو اس حق پرستی اور وطن دوستی کی سزا بھگتنی پڑی، انگریزی حکومت نے انہیں قید کر دیا اور طرح طرح سے پریشان کیا۔ اور بالآخر دونوں اخبار بند ہو گئے۔ لیکن وہ یہ قربانیاں دے کر اخبار نویسی کا ایسا معیار مقرر کر گئے اور آنے والے اخبار نویسوں کے لئے ایسا راستہ بنا گئے کہ اگر اس پیشے میں آنے والے لوگ اُن کے قدموں کے نشانوں پر چلیں تو ہماری قوم دنیا کی سب سے معزز قوم بن سکتی ہے ؞

مسجد کانپور کا جھگڑا :

اگرچہ انگریزی حکومت اور اس کے وفادار افسر شروع ہی سے مولانا کو ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کی ذات اور ان کے اخبارات کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ لیکن ابھی تک کھلم کھلا ٹکر نہ ہوئی تھی۔ یہ موقع ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ جب ہندوستان کے مشہور شہر کانپور

میں حکومت نے ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے ایک مسجد کا کچھ حصہ گرانا چاہا۔ مسجد کے سلسلے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اُسے گرایا نہیں جا سکتا۔ جب مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے حکومت کے اس فیصلے کے خلاف شور مچایا۔ کافی دنوں تک یہ تنازعہ چلتا رہا لیکن حکومت اپنی ضد سے باز نہ آئی۔ مسجد کے اس حصے کو گرا دیا گیا اور ان مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں جو اپنا دلی رنج ظاہر کرنے کے لئے اس مسجد کے پاس جمع ہو گئے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے اس واقعے پر اپنے اخبار میں زوردار مضامین لکھے اور حکومت کے اس فعل کو صاف لفظوں میں ظلم اور بے انصافی بتایا۔ اس پر حکومت نے انہیں پہلے دلی کے قریب ایک بستی مہرولی میں نظر بند اور پھر چھندواڑہ جیل میں قید کر دیا۔
یہ زمانہ مولانا اور آپ کے خاندان کے لئے سخت مصیبت کا تھا لیکن آپ نے نہایت صبر و ہمت سے ہر مصیبت کا مقابلہ کیا۔

تحریکِ خلافت :

۱۹۱۴ء کے بعد کا زمانہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے انتہائی نازک اور خطرات سے بھرا ہوا زمانہ تھا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ

پہلی جنگِ عظیم میں جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی حکومت ترکی انگریزوں کی مخالفت طاقت جرمنی کی ساتھی تھی۔ اس زمانے میں یہ سلطنت مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت مانی جاتی تھی اور اس کے بادشاہ کو خلیفہ کہا جاتا تھا۔

یہ کتاب پڑھنے والے بچوں کو شاید یہ بات معلوم ہوگی کہ ہمارے مذہب اسلام کے طاقت حاصل کرنے سے پہلے دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں بادشاہتیں قائم تھیں اور ظالم بادشاہوں نے اپنے اور اپنے خاندانوں کے فائدے کے لئے عام لوگوں کو ان کے جائز انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ عام شہری خاص طور سے کسان اور مزدور تقریباً جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ دن رات خون پسینہ بہانے کے باوجود وہ تکلیفوں سے بھری ہوئی زندگی گذارتے تھے۔ نہ انہیں پیٹ بھر کر کھانا میسر آتا تھا نہ تن ڈھانکنے کے لیئے کپڑا ملتا تھا اور نہ ان کے بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ ظالم حاکم مختلف ٹیکسوں کی صورت میں اُن کی ساری کمائی لوٹ کرلے جاتے تھے۔

اسلام نے بادشاہت کا قصہ ختم کر کے خلافت کا نظام قائم کیا۔ خلیفہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی جانشین کے

ہیں۔ اسلامی حکومت میں یہ لقب اُن بزرگوں کو دیا گیا جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حکومت کی گدی پر بیٹھے اور آپؐ کے جانشین کی حیثیت سے حکومت کا انتظام چلایا۔ سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ تھے۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ اُس شخص کو بنایا جاتا تھا جو ہر لحاظ سے قابل اور نیک ہوتا تھا۔ بادشاہت کی طرح یہ طریقہ بھی نہ تھا۔ کہ ایک خلیفہ کے فوت ہونے کے بعد اس کے بیٹے کو اُس کی جگہ خلیفہ بنایا جائے، بلکہ عقلمند لوگ آپس کے صلاح مشورے سے اُس شخص کو خلیفہ منتخب کرتے تھے جو سب سے زیادہ اہل ہوتا تھا آج کل کی سیاسی زبان میں حکومت کے اِس طریقے کو جمہوری نظام حکومت کہتے ہیں اور دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں اسی طرز کی حکومتیں قائم ہیں۔

اسلامی سلطنت وسیع ہو جانے کے بعد جب عام مسلمان دنیا کی طرف جھک گئے اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر چلنا چھوڑ دیا تو حکومت کے اِس اچھے انتظام میں بھی خرابیاں آگئیں، بادشاہت کی طرح خلافت بھی حکمران خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور حکومت حاصل کرنے

کے لئے خوفناک جنگیں ہوئیں۔

پہلے چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ (۳) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد خاندان بنی امیہ کے حکمرانوں نے خلافت کو تقریباً بادشاہت کا رنگ دے دیا اور پھر یہ نظام آخیر تک ایسا ہی رہا۔ جب ایک خلیفہ کا انتقال ہوتا تھا تو اس کا بیٹا اس کی جگہ حکومت کے اختیارات سنبھال لیتا تھا۔

جس زمانے کے حالات بیان کئے جا رہے ہیں اس زمانے میں خلافت کا اعزاز ترکوں کے عثمانی خاندان میں آگیا تھا۔ اگرچہ یہ حکمران بالکل بادشاہوں کی سی زندگی گذارتے تھے لیکن پھر بھی ایک یہ فائدہ ابھی تک حاصل تھا۔ کہ مختلف ملکوں کے مسلمان بادشاہ انہیں اپنا بڑا مانتے تھے اور بادشاہ کی جگہ خلیفہ کہلانے کی وجہ سے سچی اسلامی حکومت کا صحیح تصور باقی تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں ہار جانے کی وجہ سے عثمانی سلطنت کے بہت سے علاقے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں چلے گئے اور یہ سلطنت جو دنیا کی بہت بڑی سلطنت تھی تیسرے درجے کی چھوٹی سی کمزور سلطنت بن کر رہ گئی۔ ترکوں کی نوجوان نسل نے

جن کی رہنمائی نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کر رہے تھے یہ خیال کیا کہ ہماری قوم پر یہ مصیبت اس وجہ سے آئی ہے۔ کہ ہمارے بادشاہ کو خلیفہ کہا جاتا ہے اور ساری دنیا کے مسلمانوں کا رہنما مانا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے خلافت کو ختم کر کے یورپین ملکوں کے نمونے پر نئی حکومت قائم کرنے کے لیئے جدوجہد شروع کر دی۔

اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر اُن کے بھائی مولانا شوکت علی اور ان کی محترم والدہ صاحبہ نے ہندوستان میں خلافت کی تحریک شروع کی، اِن کی کوشش یہ تھی۔ کہ ترکی میں خلافت کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ یہ تحریک اپنے اثر اور پھیلاؤ کے لحاظ سے بہت زوردار تھی۔ اس کے اثر کا اِس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندو قوم کے بہت بڑے لیڈر مہاتما گاندھی بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔

مولانا محمد علیؒ اور ان کے مخلص ساتھیوں نے لاکھوں روپے چندہ جمع کر کے ترک مجاہدین کی امداد کے لیئے بھیجا اور جس طرح بھی ممکن ہو سکتا تھا اِس بات پر زور دیا۔ کہ انگریزی حکومت خلافت کا نظام باقی رکھنے میں مدد دے۔

مولانا اور ان کے ساتھیوں کو اپنی اِس کوشش میں تو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ خلافت کی جگہ نوجوان ترکوں کی نئی حکومت

قائم ہو گئی، لیکن خاص ہندوستان میں یہ فائدہ حاصل ہوا۔ کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ جاگ اُٹھا اور ہندو مسلمان اکٹھے ہو کر اپنے وطن کو آزاد کرانے کی جد و جہد میں مصروف ہو گئے۔

مقدمہ سازش کراچی:

انگریزی حکومت اب مولانا کو اپنا خطرناک دشمن سمجھنے لگی تھی چنانچہ اس خیال کی بنا پر آپ پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس مقدمے کی سماعت کراچی میں ہوئی اور اس وجہ سے ہماری تاریخ میں اسے مقدمہ سازش کراچی لکھا جاتا ہے، حکومت نے مولانا پر یہ الزام لگایا۔ کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے روکا ہے اور افغانستان کے بادشاہ کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا ہے۔ کہ اگر وہ ہندوستان پر حملہ کر دے تو اسے ہر طرح کی امداد دی جائے گی۔ مولانا کے ساتھ ان کے بھائی مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد۔ مولانا نثار احمد کانپوری اور ایک ہندو لیڈر شنکر اچاریہ کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔

یہ الزام نہایت خطرناک تھے اور انگریزی قانون کی رو سے
ان کی سزا پھانسی تھی لیکن اللہ پاک نے ان بےگناہوں پر یہ کرم کیا۔
کہ مقدمے کے دوران وہ خط جعلی ثابت ہو گیا جس کے بارے
میں یہ کہا گیا تھا۔ کہ یہ مولانا محمد علی جوہر کا لکھا ہوا ہے۔ خاص ایک
انگریز افسر نے اس بات کی گواہی دی۔ کہ یہ انداز تحریر مولانا محمد علی
جوہر کا نہیں ہے۔ یوں ان لوگوں کی جان بچ گئی ہے۔

آزادی کا سپاہی :

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد مولانا کانگرس میں شریک
ہو گئے اور تن من دھن سے اپنے پیارے وطن کی آزادی کے
لئے کوشش کرنے لگے۔ لیکن اس جماعت میں وہ زیادہ دیر تک نہ
رہ سکے۔ انہیں بہت جلد یہ اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو اپنا ہم وطن
اور بھائی سمجھنے والے کھرے اور سچے ہندوؤں کی جگہ آہستہ آہستہ
اس جماعت میں ایسے لوگ آ گئے ہیں جو مسلمانوں کو بھی انگریزوں کی
طرح غیر ملکی اور اپنا دشمن خیال کرتے ہیں اور اس کوشش میں مصروف
ہیں۔ کہ جب ہندوستان کو آزادی ملے تو اس ملک پر ہندوؤں کی
مذہبی حکومت قائم ہو جائے۔ اسی احساس کی بنا پر مولانا کانگرس

سے الگ ہو گئے لیکن انھوں نے ملک کی آزادی کی تحریک سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ اگرچہ اُن کی زندگی کا یہ دور بڑا ہی نازک تھا۔ اُن کی مالی حالت بھی کمزور ہو گئی تھی۔ اور بیماریوں نے بھی گھیر لیا تھا لیکن اِس حالت میں بھی اپنے وطن کو آزاد کرانے کا جذبہ پوری طرح جوان تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا کہ چالیس کروڑ ہندوستانیوں میں اُن سے بڑھ کر محبِ وطن اور حریت پسند کوئی نہ تھا۔

ملک کی آزادی یا قبر کے لئے زمین:

سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا ہندوستان کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن تشریف لے گئے یہ کانفرنس ہندوستان کو آزادی دینے کی شرطیں طے کرنے کے لئے بلائی گئی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہندوستانی جنگ جیتنے میں مدد دیں تو ان کے ملک کو آزادی دے دی جائے گی لیکن جنگ فتح ہونے کے بعد انگریز حکمران ٹال مٹول کر رہے تھے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اِس ملک پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ساری بات چیت سننے کے بعد جب مولانا

نے اسی بات کا اندازہ لگا لیا۔ کہ یہ کانفرنس محض لوگوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے اور دوسرے ملکوں کو دھوکہ دینے کے لئے بلائی گئی ہے اور اس بات چیت کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلے گا۔ تو آپ نے آزادی کی جنگ کے ایک بہادر جرنیل کی حیثیت سے وہ شاندار تقریر کی جو اس ملک کی تاریخ آزادی میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ آپ نے فرمایا :

"یا تو تمہیں میرے ملک کو آزادی دینی ہو گی ورنہ میرے لئے قبر کی زمین، کیونکہ میں ایک غلام ملک میں واپس جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

مولانا مرحوم کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے جس دن آپ نے یہ تقریر کی تھی اسی رات آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق فلسطین کے شہر بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ اعلیٰ کردار اور اسلام سے سچی محبت کے باعث آپ کو اسی سرزمین میں دفن کئے جانے کا اعزاز اور افتخار ملا جس میں ان گنت نبیوں کے مزار ہیں۔ اس ایک بات سے بھی آپ کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ

ہمارے وطن پاکستان کو علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک بنانے کا خیال سب سے پہلے انہی کے ذہن میں آیا تھا۔ اس عزت کے علاوہ انہوں نے مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے سلسلے میں بھی شاندار کام کیا۔ بہت بڑے فلسفی اور مدبر ہونے کے علاوہ وہ جادو بیان شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کے دلوں میں عزت کی زندگی گذارنے کی امنگ پیدا کی اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا درس

دیا۔

اس کتاب کے پہلے ابواب میں ہم یہ بات تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ کہ عیش پسند امیروں اور بادشاہوں کی وجہ سے ہماری قوم میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہمارے آقا اور اللہ کے سچے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سادگی، شرافت اور بہادری کے اصولوں کو اپنانے کا حکم دیا تھا۔ انہیں چھوڑ کر ہماری قوم آرام پسندی' بے پروائی اور گناہوں کے راستے پر چل پڑی تھی اور اس کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ دنیا کے ہر حصے میں مسلمان کمزور' غریب اور بے وقار ہو گئے تھے۔ ان کی عظیم الشان سلطنتیں اُن سے چھن گئی تھیں اور کئی ملکوں میں دوسری قوموں نے انہیں اپنا غلام بنا لیا تھا۔

برصغیر ہند کے مسلمان اِس عذاب میں گرفتار تھے۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز مسلمانوں کی سلطنت کو مٹا کر اس ملک کے سیاہ و سپید کے مالک بن گئے تھے اور انہوں نے ایسی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ کہ اگر ہمارے عزت والے بزرگ اپنی قابلیت اور محنت سے ان کوششوں کو ناکام نہ بنا دیتے تو سلطنت کی طرح ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب بھی ہم

سے چھن جاتی اور ہمارے اوپر ایسی غلامی مسلّط ہو جاتی۔ کہ ہمیں اس سے کبھی چھٹکارا نصیب نہ ہوتا۔

علاّمہ اقبالؒ نے اِس سلسلے میں یہ خدمت انجام دی۔ کہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو بزدلی، محکومی اور بے پروائی کی زندگی سے نفرت دلائی اور نیکی کے راستے پر چلتے ہوئے ایک مضبوط اور حکمران قوم بننے پر ابھارا، ان کے اِس پیغام کو اُن کا فلسفہ خودی کہا جاتا ہے، اپنے شعروں میں انہوں نے یہ فلسفہ یا زندگی گذارنے کا طریقہ بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

محبّت مجھے ان نوجوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

نگہ بلند، سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو تلوار ہے مومن

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

علاّمہ مرحوم کے اردو اور فارسی کلام میں زیادہ شعر ایسے ہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں صاف صاف لفظوں میں بتایا ہے۔ محکومی، کمزوری اور بے پروائی کی زندگی سچے مسلمان کے شایانِ شان نہیں حقیقی معنوں میں مسلمان وہی ہے جو نہ صرف خود معزز اور طاقتور ہو بلکہ تمام انسانوں کو معزز، خوشحال اور طاقتور بنانے کی کوشش کرے۔

طاقت، عزت اور خوشحالی ایسی اچھائیاں ہیں جن کی ہر شخص تمنا کرتا ہے۔ اور اِس لحاظ سے بظاہر اقبالؒ کے فلسفے یا پیغام میں کوئی ندرت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن یہ فیصلہ اُن لوگوں کا ہے جو نہ ہمارے مقدّس مذہب اِسلام کو پوری طرح سمجھتے ہیں' اور نہ انہوں نے علاّمہ اقبالؒ کے کلام کو غور سے پڑھا ہے۔ جن لوگوں نے غور کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک عام دنیادار اور دنیا پرست اِنسان اور ایک سچے مسلمان کی منزلیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے نظریات و خیالات میں ایک نہایت واضح فرق یہ ہے

کہ دنیادار جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ذات کے لئے حاصل
کرنا چاہتا ہے اور اُسے جو کچھ بھی مل جاتا ہے۔ اس سے جی بھر کر
فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ایک سچّا مسلمان اپنی ذات کو بھلا کر خلقِ خدا
کی بہتری اور بھلائی کی تمنّا کرتا ہے اور جو کچھ اسے ملتا ہے اس
کا زیادہ حصہ دوسروں کی بھلائی کے کاموں میں خرچ کر ڈالتا
ہے۔ بس یہی فرق ایک عام دنیا پرست اور علامہ اقبال کے فلسفے
میں ہے، وہ طاقت اور اقتدار کی تمنا اس لئے کرتے ہیں۔ کہ
مسلمان اللہ کی فوج کے سپاہی بن کر اس دنیا کو برائیوں سے پاک
کر دیں، کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کریں اور ظالموں کی جڑ
کاٹیں۔

اقبالؒ کا پیغام دراصل قرآن کا پیغام ہے۔ ان کی
خوبی یہ ہے۔ کہ انہوں نے اِس آسمانی پیغام کو شعروں کے روپ
میں ڈھال کر ہم تک پہنچایا اور ایسے انداز میں پہنچایا۔ کہ سیدھے
راستے سے بھٹکی ہوئی ہماری قوم کے دل میں پھر سچائی کی لگن پیدا
ہوگئی۔ اور جو لوگ مغرب کے فلسفیوں سے مرعوب ہو کر اُن کی غلط
اور ہلاک کر دینے والی باتوں کو اپناتے جارہے تھے پھر اپنی اصل
منزل کی طرف لوٹ آئے۔ یقیناً یہ ان کا بہت بڑا اعجاز اور

بہت بڑا احسان ہے۔

خاندان :

علامہ اقبال کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے اور شروع میں ہندو مذہب کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔ پھر اِس خاندان نے اسلام قبول کر لیا اور کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ شہر میں آ بسا۔

علامہ اقبالؒ کے والد صاحب امیر آدمی تو نہ تھے لیکن نہایت دیندار انسان تھے۔ یہی حال اُن کی والدہ صاحبہ کا تھا۔ مذہب کا اثر کم ہونے کی وجہ سے مسلمان عورتیں بھی عام طور سے گھر کی سجاوٹ، لباس کی درستی اور اِسی طرح کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ لیکن اقبالؒ کی والدہ صاحبہ گھر کے کام دھندوں کے علاوہ اللہ پاک کے احکام کا بھی خیال رکھتی تھیں۔

ایسے خدا پرست اور نیک ماں باپ کے ہاں اقبال نے جنم لیا۔ وہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو اِس دنیا میں آئے۔ بعض لوگوں نے ان کی پیدائش کی تاریخ میں اختلاف کیا ہے لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں۔ فرق بھی ہوا تو ایک آدھ سال کا ہی ہوگا۔

اقبال بچپن ہی سے بے حد ذہین اور اچھائیوں کو پسند کرنے والے تھے۔ انہوں نے ایف۔ اے تک اپنے شہر سیالکوٹ ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ایم۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔

خواہ کوئی بھی ہو استادوں کی توجہ اور مہربانی کے بغیر قابلیت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی مہربان ہستیاں ہوتی ہیں جو ذرّوں کو چاند سورج کی طرح چمکا دیتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اقبالؒ کو نہایت اچھے استاد ملے ان میں دو استادوں نے تو اُن کے خیالات اور ان کی زندگی پر بہت ہی اثر ڈالا۔ ایک مولوی سید میر حسن اور دوسرے ڈاکٹر آرنلڈ۔

دوسرے صاحب قومیت کے لحاظ سے انگریز تھے لیکن انہوں نے اقبالؒ کو ایک بڑا آدمی بنانے میں بہت امداد دی۔ ڈاکٹر آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ پڑھاتے تھے اور ان کے سیکڑوں شاگرد تھے لیکن اقبالؒ کے ساتھ ان کا سلوک خاص تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ملازمت کی مدت ختم کر کے اپنے وطن چلے گئے۔ تو پھر بھی اپنے اس ہونہار شاگرد کو یاد رکھا اور جب اقبالؒ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے تو ان کی ہر طرح مدد کی۔

یہی حال مولوی سید میر حسن صاحب کا ہے۔ انہوں نے علم حاصل کرنے کے شوق کے علاوہ اقبالؒ کے دل میں اسلام کی سچی

محبت پیدا کی اور ہر حال میں اُن کے مربی اور معاون بنے رہے ،
خود علامہ اقبال ؒ نے مولوی صاحب کے اِس احسان کو مانا ہے
اُن کی احسانمندی کا یہ حال ہے ۔ کہ جب ۱۹۲۲ء میں حکومت
نے انہیں سر کا خطاب دیا تو انہوں نے اِس شرط کے ساتھ
یہ خطاب قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کے ساتھ اُن کے
استادِ محترم مولوی سید میر حسن صاحب کو بھی خطاب سے نوازہ جائے ۔
اِس سلسلے میں گورنمنٹ نے یہ عذر پیش کیا کہ خطاب صرف ان لوگوں
کو دیے جاتے ہیں جنہوں نے کوئی بلند پایہ کتاب لکھی ہو اور مولوی
صاحب نے ابھی تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ۔ اِس اعتراض
کے جواب میں اقبال ؒ نے کہا ۔ مولوی صاحب کی ایک بڑی
تصنیف میں ہوں ۔ چنانچہ حکومت عزت والے شاگرد کی اِس
عقیدت کے سامنے لاجواب ہو گئی اور مولوی صاحب کو بھی
شمس العلماء کا خطاب عطا کیا گیا ۔

اِس واقعے کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ
ہوگا ۔ کہ علامہ اقبال ؒ کو جو عزت اور عظمت حاصل ہوئی وہ والدین
کی دعاؤں اور استادوں کی توجہ کی بدولت حاصل
ہوئی ۔

نہ سیچ نہ سیچ

انگلستان کا سفر:

ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت مل گئی تھی لیکن ابھی علم حاصل کرنے کا شوق پورا نہ ہوا تھا۔ وہ علم کے سمندر سے پوری طرح اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں کی عظیم الشان یونیورسٹی کیمبرج میں داخلہ لیا۔ اس سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ان کے بڑے بھائی صاحب نے اُن کی مدد کی۔

اس منزل میں اقبالؒ کے دوستوں میں ہمیں ایک اور نہایت معزز اور شفیق ہستی کا نام ملتا ہے۔ یہ اردو زبان کے بہت بڑے محسن سر عبدالقادرؒ ہیں۔ قیامِ انگلستان کے دَور میں ایک وقت ایسا آیا کہ علامہ اقبالؒ شاعری سے بددل ہو گئے اور انہوں نے شعر و شاعری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن سر عبدالقادر نے قیمتی مشورے دے کر انہیں اِس ارادے سے باز رکھا۔ علامہ اقبالؒ کی مشہور کتاب بانگِ درا میں ایک مشہور نظم شامل ہے جس کا عنوان "سر عبدالقادر کے نام" ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ

بھی شیخ سر عبدالقادرؒ مرحوم ہی نے لکھا ہے :

اعلیٰ ڈگریاں :

علامہ اقبالؒ نے کیمبرج سے فلسفۂ اخلاق کی اور ایک جرمن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انگلستان کے علمی حلقوں میں انہیں کس قدر مقبولیت اور عزت حاصل ہوئی۔ اس کا ثبوت صرف اس ایک بات سے ملتا ہے۔ کہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئے تو لندن یونیورسٹی میں پروفیسر کی جگہ دی گئی۔ اور انہوں نے تین سال تک اس یونیورسٹی میں عربی پڑھائی :

وطن کو واپسی :

اعلیٰ علمی ڈگریاں اور مقبولیت و شرافت کی سندیں لے کر علامہ اقبالؒ اپنے وطن لوٹے، یہاں آپ نے لاہور میں رہائش اختیار کی۔ اور گنتی کے چند دنوں میں اس تاریخی شہر کی علمی و ادبی مجلس کے سب سے روشن چراغ بن گئے۔

انہوں نے شروع شروع میں بیرسٹری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ شغل ان کے ذوق اور مزاج کے مطابق نہ تھا۔ اللہ پاک

نے انہیں کسی ادبی خدمت کے لئے پیدا کیا تھا۔ بہت جلد انہیں کچہریوں میں جا کر مقدمے لڑنے کے چکر سے نجات مل گئی اور وہ اپنا پورا وقت شعر و شاعری اور دوسری علمی مصروفیات میں گذارنے کے قابل ہو گئے۔

اگرچہ اقبالؒ لاہور کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور ان کا کلام اونچے درجے کے اخبارات و رسائل میں بھی چھپتا تھا لیکن حقیقی شہرت انہیں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں کے اسٹیج سے حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، نالۂ یتیم اور شمع و شاعر وغیرہ اسی انجمن کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں اور ان کا نام سارے ملک میں گونج گیا؛

قومی خدمت کا جذبہ؛

قابلیت حاصل کرنے کے بعد عام لوگوں کے دلوں میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے، کہ انہیں کوئی بڑا عہدہ مل جائے اور وہ خوب عیش آرام کی زندگی گزاریں۔ لیکن اقبالؒ کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی، کہ وہ اپنی قوم کی بھلائی کے کام کریں اور اسے اس پستی اور ذلت سے نکال لیں جس میں وہ مبتلا ہو گئی ہے۔ اپنے اس

مبارک جذبے کی وجہ سے انہوں نے سیاسی کاموں میں حصہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۶ء کے الکشن میں انہوں نے حصہ لیا اور پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے ممبر چنے گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان غلام تھا۔ صوبوں کے گورنر انگریز تھے۔ اور وہ اس بات کے لئے پوری پوری کوشش کرتے تھے۔ کہ ان کی حکومت کے وقار اور فائدے کے خلاف کوئی قانون نہ بن سکے۔ اس کے علاوہ بد قسمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی اچھی خاصی رسہ کشی شروع تھی۔ خاص طور سے پنجاب کے ہندو اس کوشش میں رہتے تھے۔ کہ مسلمان طاقتور نہ ہو سکیں۔ یہ کشمکش اسمبلی کے اندر بھی جاری تھی۔ بلکہ وہاں کچھ زیادہ شدت لئے ہوئے تھی۔ علامہ اقبالؒ یہ جذبہ لے کر ممبر بنے تھے۔ کہ اسمبلی میں جا کر اپنی قوم کی بھلائی کے لئے اچھے اچھے قانون بنوائیں گے لیکن ممبر بننے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ موجودہ حالات میں ایسے قانون کسی طرح بھی نہیں بن سکتے۔ غیروں کی مخالفت کے علاوہ خود مسلمان قوم اپنی بھلائی کے کاموں سے بہت غافل تھی۔ ان ساری باتوں کا اندازہ لگا کر انہوں نے کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔

مسلم لیگ کی صدارت :

اس زمانے میں مسلم لیگ کام تو کر رہی تھی لیکن اس میں مسلمانوں کی خدمت کی سچی تڑپ نہ تھی۔ اس جماعت میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو ہندو قوم کے تنگ دل لوگوں سے چڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنی قوم کو طاقتور تو دیکھنا چاہتے تھے لیکن اُن کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام نہ تھا۔ ایسے حالات میں علامہ اقبالؒ کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا اور انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے انہیں باقی ہندوستان سے الگ کر کے ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔ اقبالؒ نے اس اسلامی ریاست کو پاکستان کا نام نہ دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر یہی مطالبہ پاکستان کا مطالبہ بنا اور قائد اعظم کی رہنمائی میں مسلمان اپنا یہ مطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گئے۔

اقبالؒ اگرچہ عام سیاسی لیڈروں کی طرح جلسوں اور کانفرنسوں میں تقریریں نہیں کرتے تھے۔ ورنہ اخبارات میں لمبے چوڑے بیانات چھپواتے تھے لیکن ان کی قابلیت اور قوم سے سچی محبت کا یہ کرشمہ تھا۔ کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد سچے دل سے اُن کا احترام کرتی

تھی اور یہ عقیدہ رکھتی تھی۔ کہ مسلمان قوم کی بھلائی کے کاموں میں
اُن کی رائے نہایت معقول ہوتی ہے۔ اِس عقیدت اور اعتماد
کی وجہ سے انہیں مسلمانوں کا نمائندہ بنا کر گول میز کانفرنس لندن
میں بھیجا گیا۔

گول میز کانفرنس کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے
کہ یہ کانفرنس ہندوستانیوں کے حقوق کا فیصلہ کرنے کے لیئے
بلائی گئی تھی۔ اُن دنوں ایک بڑی اُلجھن تو یہ تھی۔ کہ برطانوی حکومت چاہتی
تھی، ملک کو اپنی سرپرستی میں رکھتے ہوئے کچھ حقوق دے دیئے
جائیں۔ اِس کے علاوہ اس سے بھی بڑی اُلجھن ہندوؤں اور مسلمانوں
کے لیڈروں کا اختلاف تھا۔ ہندو قوم کے بعض تنگ دل لیڈروں
کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ آزادی
حاصل کرنے کے بعد انگریز کی جگہ ہندو ہمارا حاکم بن جائے گا۔
اور اس کی غلامی انگریز کی غلامی سے بھی بری ہو گی۔ اِسی خدشے
کی بنا پر وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ دونوں قوموں کے حقوق کا فیصلہ
ہو جائے۔

علامہ اقبالؒ نے اِس کانفرنس میں اپنی قوم کی نمائندگی
کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اگرچہ وہ اپنی قوم کے حقوق کا دوٹوک فیصلہ

نہ کرا سکے۔ لیکن انہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں پر یہ بات واضح کر دی۔ کہ مسلمان اپنے جائز حق کی پوری پوری حفاظت کریں گے :

شاندار علمی خدمات :

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں علامہ اقبال سیاسی لیڈر نہ تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کی محبت سے مجبور ہو کر سیاسی کاموں میں حصہ لیا تھا، اُن کا اصل میدان تو فلسفہ و ادب اور شاعری تھا۔ چنانچہ کانفرنس سے فارغ ہو کر وہ اسلامی ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے وطن لوٹے اور پھر یکسو ہو کر اپنے علمی کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہی زمانہ اُن کے پیغام کے عروج اور نکھار کا زمانہ ہے۔ اب انہوں نے نہایت زوردار لفظوں میں مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور اپنے حالات سدھارنے کی دعوت دی :

وفات :

احساس کی شدت اور خیالات کے دباؤ کے باعث آخر میں علامہ کی صحت خراب رہنے لگی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ اپنے

مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ سارے ملک میں بلکہ تمام اسلامی ملکوں میں اُن کی وفات کا سوگ منایا گیا اور اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے جلیل القدر فرزند تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس قوم کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑایا اور اس قابل بنایا کہ آنے والے حالات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکے۔ اللہ پاک ان کی روح پہ رحمتیں نازل کرے ؎

کتبہ محمد شریف شاہ گجرات - اپریل ۱۹۶۴ء

اسلام کے نامور فرزند
نظر زیدی
احسن برادرز، چوک انارکلی، لاہور